فروغِ فکر و آگہی کے لئے

ماہنامہ

پیام

اسلام آباد

ABC سے تصدیق شدہ اشاعت

مئی تا جولائی 2026

محرم الحرام نمبر



- کربلا: اسباب و علل
- کربلا کی خواتین
- خواتین کربلائی ماؤں کی سیرت کیسے اپنائیں؟
- کربلا اور امام حسینؑ (قیام حسینی کے اہداف و مقاصد اور موجودہ حالات)
- امام حسینؑ اور عشق الٰہی کے جلوے
- سید الشہداء علیہ السلام کا اپنے قیام کے دوران قرآن سے استدلال
- تحریک کربلا میں اصحاب رسولؐ اللہ کا کردار
- مقصد قیام امام حسینؑ، بقائے اسلام، احترام انسانیت

حکومت پنجاب کی طرف سے تعلیمی اداروں اور پبلک لائبریریز کے لیے منظور شدہ

پیام

ماہنامہ — فروغِ فکر و آگہی کے لیے — اسلام آباد

جلد 29 شمارہ 5-7

ABC سے تصدیق شدہ اشاعت

Regd. No. ID 311

ISSN 1562-0018

PO Box No 416
Islamabad
051-2218005
+92 3224148058

البصیرہ

albasirah saqib akbar ukhuwat
+92 - 322 - 4148058 / +92 - 308 - 9786572
Albasirah, Shah Allah Dita, Islamabad

شمارہ ھذا: -/500 روپے   زر سالانہ -/1200 روپے

زر سالانہ امریکہ، کینیڈا، یورپ -/190 ڈالر

مڈل ایسٹ -/90 ڈالر

کرنل (ر) اشجار حسین نے شجاع سنز آبپارہ اسلام آباد سے چھپوا کر البصیرہ شاہ اللہ دتہ اسلام آباد سے شائع کیا۔

فہرست مضامین
پیام محرم الحرام نمبر 2026

اداریہ

سید نثار علی ترمذی

کربلا: ہر عہد کا زندہ سوال

محرم الحرام کا چاند طلوع ہوتے ہی تاریخ کا ایک ایسا باب ہمارے سامنے کھل جاتا ہے جو کبھی کہنہ نہیں ہوتا۔ یہ صرف چند دنوں کی یاد، چند رسوم کی ادائیگی یا ایک تاریخی سانحے کا تذکرہ نہیں، بلکہ انسانی ضمیر کے احتساب کا موسم ہے۔ کربلا ایک واقعہ ہی نہیں بلکہ ایک تحریک ہے، جس کا پیغام زمان و مکان کی حدود سے بلند ہے۔ اسی لیے ہر سال محرم ہمیں یہ یاد دلانے آتا ہے کہ حق و باطل کی کشمکش ختم نہیں ہوئی، صرف اس کے کردار بدل گئے ہیں۔

کربلا میں ایک طرف اقتدار، طاقت، جبر اور مصلحت کا نظام تھا، اور دوسری طرف حق، صداقت، عدل، آزادیٔ ضمیر اور رضائے الٰہی کی خاطر ہر قربانی دینے کا عزم۔ وقت گزرنے کے ساتھ نام بدل گئے، چہرے بدل گئے، مگر یہ دو صفیں آج بھی قائم ہیں۔ ہر دور میں ایک فکرِ حسینیؑ ہوتی ہے اور ایک طرزِ یزیدی۔ سوال یہ ہے کہ چودہ سو برس بعد ہم کس کے ساتھ ہیں۔ سوال یہ بھی ہے کہ آج ہم کس صف میں کھڑے ہیں۔

ہم میں سے بعض کے ہاتھ میں قلم ہے۔ قلم محض الفاظ لکھنے کا ذریعہ نہیں، بلکہ تاریخ کا امین بھی ہے۔ یہ حق کی گواہی بھی دے سکتا ہے اور باطل کی ترجمانی بھی کر سکتا ہے۔ اگر قلم سچ کو چھپائے، ظلم کو جواز دے یا مظلوم کی آواز دبانے میں شریک ہو جائے تو وہ اپنی امانت سے روگردانی کرتا ہے۔ اگر وہ حق کی شہادت دے، انصاف کی آواز بلند کرے اور معاشرے کے ضمیر کو بیدار کرے تو یہی قلم حسینی پیغام کا امین بن جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے مال، وسائل، اختیار اور اثر و رسوخ عطا کیا ہے۔ یہ نعمتیں محض ذاتی آسائش کے لیے نہیں بلکہ ایک امتحان بھی ہیں۔ انسان کے وسائل کس مقصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں؟ کیا وہ عدل، خیر اور انسانیت کی خدمت میں صرف ہو رہے ہیں یا ظلم، ناانصافی اور استحصال کے نظام کو تقویت دے رہے ہیں؟

کربلا ہمیں بتاتی ہے کہ وسائل بھی غیر جانب دار نہیں رہتے، وہ یا حق کی تائید کرتے ہیں یا باطل کی تقویت۔ پھر ایک طبقہ وہ بھی ہے جو خود کو اس سارے معرکے سے الگ سمجھتا ہے۔ وہ نہ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتا ہے، نہ حق کا ساتھ دیتا ہے، نہ باطل کی مخالفت کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیا، اپنے مفادات اور اپنی آسائشوں میں مگن رہتا ہے۔ مگر تاریخ یہ سبق دیتی ہے کہ جب حق اور باطل

آ منے سامنے ہوں تو خاموشی بھی ایک فیصلہ بن جاتی ہے اور بے حسی بھی ایک کردار۔

امام حسینؑ نے صرف اپنے عہد کے ظلم کو چیلنج نہیں کیا، بلکہ ہر آنے والے زمانے کے انسان کو ایک معیار عطا کیا۔ وہ معیار یہ ہے کہ حق کا ساتھ حالات دیکھ کر نہیں، اصول دیکھ کر دیا جاتا ہے۔ قربانی کا پیمانہ تعداد نہیں، نیت ہوتی ہے اور کامیابی کا معیار اقتدار نہیں، کردار ہوتا ہے۔ محرم کا پیغام ہمیں صرف آنسو بہانے کی دعوت نہیں دیتا، بلکہ اپنے ضمیر کو جگانے کی دعوت دیتا ہے۔

یہ ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے پر آمادہ کرتا ہے کہ ہماری زبان، ہمارا قلم، ہمارا مال، ہماری صلاحیتیں اور ہماری خاموشی کس صف کو مضبوط کر رہی ہیں۔ کیونکہ کربلا ہر سال ایک ہی سوال دہراتی ہے، اور اس سوال کا جواب ہر انسان کو خود دینا ہوتا ہے۔ آج کے کربلا میں میرا کردار کیا ہے؟ اگر اس سوال کا جواب ہم نے دیانت داری سے تلاش کر لیا تو محرم ہمارے لیے صرف یاد کا مہینہ نہیں رہے گا، بلکہ اصلاحِ نفس، تجدیدِ عہد اور حق کے ساتھ وابستگی کا نقطۂ آغاز بن جائے گا۔ یہی کربلا کا زندہ پیغام ہے اور یہی محرم کی حقیقی روح۔

ماہنامہ پیام گذشتہ تیس برس سے علم وآ گہی کے فروغ کے لیے کوشاں ہے۔ مختلف اہم مناسبتوں پر ہماری کوشش ہوتی ہے کہ قارئین کے لیے کچھ نیا علمی مواد پیش کیا جائے۔ ہم نے اس شمارے کے لیے جو دعوتی اشتہار شائع کیا اس میں موضوعات کو اسی تناظر میں ترتیب دیا گیا کہ تحریک کربلا کے حوالے سے نئے زاویوں پر روشنی ڈالی جائے تاہم وقت کی قلت یا لکھاریوں کی مصروفیت کے سبب مطلوبہ مطالب کی جمع آوری ممکن نہ ہوئی جن موقر لکھاریوں کی تحریریں موصول ہوئیں ادارہ اس تعاون پر ان کا تہ دل سے ممنون ہے۔ آپ کا تعاون وسرپرستی ہمارا اثاثہ ہے۔ قارئین جو مطالعہ کے ذریعے ہماری حوصلہ افزائی فرماتے ہیں بھی لائق تعظیم ہیں۔ آپ کے تاثرات اور تجاویز کا منتظر

ایڈیٹر ماہنامہ پیام

سید نثار علی ترمذی

کربلا: اسباب و علل

(رہبر مسلمین کے خطاب سے اقتباس)

ترتیب و تدوین: آئی ایس او

حقیقت یہ ہے کہ ابھی تک دنیا کربلا کے عظیم المیہ سے پوری طرح آگاہ نہیں ہوسکی ہے۔ اس کے تمام پہلو نمایاں نہیں ہوئے ہیں۔ خود مسلمان بھی اس حادثے سے ناآشنا ہیں یہاں تک کہ خود ہماری قوم جو امام حسینؑ سے واقف ہے، حسین ابن علیؑ اور عاشورہ و محرم کی یاد منانا اس کی عادات میں شامل ہو چکا ہے وہ بھی اس حادثے سے پوری طرح آشنا نہیں ہے۔ گو الحمد للہ گذشتہ بیس برسوں میں انقلابی تحریک کی برکت سے عاشورہ کے بارے میں نئی اور اہم باتیں کہی گئی ہیں۔ مفکروں، دانشوروں، اہل قلم اور محققین نے کچھ ایسی چیزیں بیان کی ہیں جن سے کافی حد تک اس کا چہرہ نمایاں ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود اب بھی بحث و گفتگو کی گنجائش باقی ہے۔

امام حسینؑ کی تحریک کا بنیادی نکتہ ”اسلامی حکومت کو امامت سے ملوکیت میں تبدیل کیے جانے کے خلاف جہاد ہے“۔ میرے خیال میں اگر اس نکتہ پر انحصار کریں تو اسلامی حکومت کے متعلق ہماری گذشتہ بحثوں سے اس کا ربط بھی برقرار رہے گا۔

اسلامی حکومت کے امتیازات

جیسا کہ گذشتہ خطبوں میں ”حکومت اسلامی الٰہی شریعتوں کے نقطۂ نظر سے“ کے عنوان کی تحت عرض کر چکا ہوں کہ الٰہی ادیان میں حکومت کی اساس و بنیاد اس اساس و بنیاد سے مختلف ہیں جو دنیا پرست، توسیع پسند اور ابن الوقت عناصر اپنی حکومت کے لیے قرار دیتے ہیں۔

دنیا پرست اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کے لیے عوام پر مطلق العنان حکومت کے قائل ہیں۔ چاہے یہ وہ حکمران ہوں جو مدبر اور لائق تھے اور تاریخ انھیں طاقتور اور مدبر حکمران کے عنوان سے یاد کرتی ہے یا نالائق اور بزدل بادشاہ ہوں۔ یہ سب اس حوالے سے ایک ہی جیسے ہیں کہ وہ عوام پر حکومت کو اپنے عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتے تھے اور آج بھی دنیا کی یہی حالت ہے۔ جس شخص کو حکومت مل جاتی ہے وہ سمجھتا ہے کہ اسے عیش و عشرت کی زندگی مل گئی پوری دنیا کی یہی حالت ہے شاید دو ایک ملکوں کو مستثنیٰ کیا جاسکے۔

اسلامی اور دینی تعلیمات کی رو سے حکومت ایک فریضہ ہے سخت و پرخطر ذمہ داری ہے۔ جہاں قدم قدم پر محرومیوں کا سامنا ہے۔ حکومت دراصل سنگین ترین ذمہ داری کا بوجھ اٹھانا ہے۔ یہاں یہ تصور نہیں کہ حکومت پانے والا اپنی کسی خواہش کے لیے بندگان خدا کو اپنے چنگل میں پھنسا لے۔ مال اللہ کو رنگین و پرتکلف دسترخوان سمجھے اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیاوی اقتدار پرستوں کی اصطلاح میں حکومت سلطنت ملوکیت اور بادشاہی ہے لیکن اسلام میں اسے ریاست کہا جاتا ہے اس کا نام خلافت اللہ ہے۔ اس کا نام ولایت اور عوام کے امور کی ذمہ داری ہے۔ یعنی حد یہ ہے کہ حکومت کے نام میں بھی ذمہ داریوں کی طرف اشارہ موجود ہے۔

پیغمبرؐ اسلام نے سماجی نظام اور عوام کی زندگی کے سلسلے میں جو سب سے بڑا قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ عوام کو طاغوتوں کے چنگل سے نجات دلا دی اور اپنی الٰہی قیادت و امامت ولایت کے زیر سایہ انھیں بندۂ خدا بنا دیا۔

"لیخرج الناس من عبادة العباد الی عبادة الله و من طاعة العباد الی طاعة الله"

امام صادقؑ سے روایت ہے کہ پیغمبر اسلام نے لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے آزادی دلائی جو خود بندگان خدا ہیں مگر زبردستی دوسروں کو اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ انھیں ولایت الٰہی کے زیر سایہ جگہ دی، ولایت الٰہی آزادی عزت اور عظمت کا نقطۂ کمال ہے۔

آنحضرتؐ کے بعد بھی کسی حد تک یہ خصوصیت باقی رہی ہر چند کچھ اختلافات پیش آئے اور اس الٰہی انسانی شریفانہ حکومت کو ٹھیس پہنچی۔ مسلمان فتوحات اور دیگر اسباب کی بنا پر دولت وثروت عیش وآرام اور مال دنیا میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح کے مسائل ضرور پیش آئے لیکن حضرت علیؑ کے دورِ اقتدار میں وہی الٰہی حاکمیت پلٹ آئی اور اسلامی حکمران یعنی حضرت علیؑ عوام کو حقیر و ذلیل سمجھنے اور ان سے غرور وتکبر سے پیش آنے کے بجائے عوام کی ایک فرد بن گئے بلکہ دنیاوی زندگی کی آسائشوں کے لحاظ سے آپ دوسروں سے کہیں زیادہ نچلی سطح پر زندگی بسر کرتے تھے۔

امیر المومنینؑ نے اس حالت کو اپنایا تا کہ عوام کو عیش وعشرت کے متعفن دلدل اور طاغوتی زندگی میں غرق ہونے سے بچائیں۔ عصر جاہلیت کی اس بلا سے محفوظ رکھیں جو دوبارہ عوام کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ امیر المومنینؑ نے دوبارہ اسی طرح کا اسلامی معاشرہ قائم کر دیا لیکن آپ کی شہادت کے بعد معاشرے میں دوبارہ وہی چیزیں رونما ہونے لگیں جس سے انبیاء واوصیاء عوام کو بچانا چاہتے تھے۔ یعنی دوبارہ وہی ظلم واستبداد، کینہ پروری جڑ پکڑنے لگی۔ اسلامی بنیادوں کے بجائے جاہلی اساس پر حکومت دوبارہ پلٹ آئی۔ یعنی دوبارہ اسی حالت نے جنم لے لیا جس کی جانب امیر المومنین نے اپنی حکومت کی آغاز میں اشارہ کیا تھا۔

"الا و ان بلیتکم قد عادت کھیئتھا یوم بعث الله نبیه"

"آگاہ ہو جاؤ کہ آج تمھارے لیے وہ آزمائشی دور پلٹ آیا ہے جو اس وقت تھا جب پروردگار نے اپنے رسولؐ کو بھیجا تھا۔"
(نہج البلاغہ۔ خطبہ ١٦)

حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد وہی ساری خصوصیاتِ ظلم واستبداد میں اضافے کے ساتھ عصرِ معاویہ و یزید میں دوبارہ

پلٹ آئیں۔خلفائے اوّل (خلفائے راشدین) کے زمانے میں استبداد نہیں تھا اس دور میں عوام کو اعتراض کرنے کا حق حاصل تھا اس وقت لوگوں میں اتنی جرأت تھی کہ خلیفہ کے منبر کی سامنے کھڑا ہوکر اس پر اعتراض کرتے تھے اور اگر عصرِ جاہلیت کے عادات واطوار کے لوٹائے جانے کے خلاف آواز اٹھانے والوں پر سختی کی بھی جاتی تھی تو اس حد تک کہ مثلاً ابوذر ؓ کو جلاوطن کر کے ربذہ بھیج دیا گیا یا عمار یاسر ؓ کو خلیفہ کے سامنے مارا گیا۔اس سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

حقیقی مومنین اور پیغمبر کے باوفا اصحاب جن کی تعداد کم بھی نہ تھی۔دل کی بات زبان پر لا سکتے تھے،فضا کسی حد تک آزاد تھی اس وقت مومنین کے لیے ممکن تھا کہ جاہلی اقتدار کی طرف بڑھتے قدم روک دیں جاہلی سیاست کے خلاف آواز اٹھائیں لیکن حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد ایسے حالات طاری کر دیئے گئے جن میں سانس لینا بھی ممکن نہ تھا۔

مورخین امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد کی جو تصویر پیش کرتے ہیں وہ اس دور کے عوام خصوصاً مسلمین ومومنین کے لیے اتنی بڑی مصیبت ہے جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ابھی پیغمبر اسلام کی وفات کو نصف صدی بھی نہیں گزری ہے ابھی اسلام تر و تازہ ہے عوام مسلم ہیں ابھی بہت سے شہر اور ملک دامنِ اسلام میں پناہ لے رہے ہیں اس کے باوجود اسلامی اصولوں کو مسخ کیا جا رہا ہے ہر چیز بدل رہی ہے۔

حضرت امیرؑ کی شہادت کے بعد جو کچھ ہوا اس روایت کے مصداق ہے جسے امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے نقل کیا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا: اذا ابلغ آل ابی العاص ثلاثین جب آل ابی العاص (بنی امیہ کی اہم شاخ ہے جس نے تقریباً پچاس سال تک عالم اسلام پر حکومت کی ہے مروان ابن حکم سے مروان حمار تک) کی تعداد تیس ہو جائے گی تو: اتخذ وا عباد اللّٰہ خولا و مال اللّٰہ دولا و دین اللّٰہ دخلا (یعنی جب ابوالعاص کی اولاد کی تعداد تیس کو پہنچ جائے گی تو خدا کے بندوں کو اپنا غلام اور خدا کے مال کو اپنا مال سمجھے گی اور دینِ خدا میں بھی حسبِ منشا دخل اندازی کرے گی۔)

الٰہی اور طاغوتی حکومت کا فرق

امام حسینؑ نے جس چیز کے خلاف تحریک شروع کی،آپ کے قیام سے پہلے دنیائے اسلام جس میں مبتلا تھی اور جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے سب سے بڑی مصیبت بنی ہوئی تھی اسے تین نکات کی صورت میں بیان کیا جا سکتا ہے۔الٰہی اور طاغوتی حکومت کا فرق ان ہی تین نکتوں میں پوشیدہ ہے۔

پہلا نکتہ: ظالم و طاغوتی حکومت مالِ اللّٰہ کو اپنا مال سمجھتی ہے۔روئے زمین پر پائے جانے والی دولت، بیت المال، عوامی ٹیکس اور وہ چیزیں جنھیں تمام لوگوں میں تقسیم ہونا چاہیے اور جن ذرائع سے تمام لوگوں کو مستفید ہونا چاہیے ان چیزوں کو طاغوتی حکومتیں نہ صرف یہ کہ تمام عوام کی ملکیت تصور نہیں کرتیں، نہ صرف یہ کہ غریب ومحروم عوام کو صاحبِ حق و حصے دار نہیں سمجھتیں اور نہ صرف یہ کہ طاقتور مالداروں کو لوٹ کھسوٹ سے منع نہیں کرتیں بلکہ اس کے برعکس غریبوں،محروموں اور کمزوروں کو خداداد دولت

سے محروم اور مالِ اللہ پر اپنی اجارہ داری قائم کر لیتی ہیں۔ وہ اور ان کے گماشتے مالِ خدا کو بھنبھوڑتے رہتے ہیں۔

یہ طاغوتی حکومت کی ایک خصوصیت ہے۔ لیکن الٰہی حکومت مالِ خدا کو امت کا مال سمجھتی ہے جس میں اس کی تمام بندے حصے دار و شریک ہیں۔ اسلامی حاکم مالِ خدا کو غریب ترین بندوں میں تقسیم کرتا ہے۔ غریب اور محروم افراد کو مالدار اور تونگر افراد پر ترجیح دیتا ہے اور خود کو معاشرے کی سب سے نچلی صف میں قرار دیتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کی حکومت آپ کے سامنے ہے۔ امیر المومنینؑ اتنا معمولی کھانا کھاتے اور اتنا معمولی کپڑا پہنتے تھے کہ اس زمانے میں اس سے معمولی کھانے اور کپڑے کا وجود ہی نہ تھا۔

امام حسینؑ جس حکومت کے متمنی تھے وہ ایسی ہی حکومت تھی لیکن آلِ ابی العاص جن کی حکومت سے پیغمبرِ اسلام مسلمانوں کو ڈراتے تھے ان میں یہ صفت مفقود تھی۔

دوسرا نکتہ: ”وعباد اللہ خولاً“ طاغوتی حکمرانوں کی ایک دوسری خاصیت یہ ہے کہ وہ بندگانِ خدا کو اپنا غلام تصور کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے وہ زبان سے نہ کہیں کہ عوام ہمارے غلام ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے حکمران عوام کو اپنا غلام سمجھتے ہیں۔ یہ وہی چیز ہے جو پہلی صدی میں بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومت میں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ امیر معاویہ کے دور میں اس کا آغاز ہوا عصرِ یزید میں پروان چڑھی اور مروان و عبدالملک کے عہد میں اپنے عروج کو پہنچ گئی اور اسی طرح آگے بڑھتی گئی۔ یہ حکومتیں سچ مچ عوام کو اپنا غلام سمجھتی تھیں بس فرق اتنا ہے کہ شروع میں زبان سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی لیکن چند دہائی گزر جانے کی بعد تیسری صدی ہجری کے آغاز یا دوسری صدی ہجری کے اختتام میں عرب کا معروف مصنف جاحظ اپنی کتابوں میں واضح الفاظ میں لکھتا ہے کہ ”عوام امیر المومنین کے غلام ہیں“ یعنی اس فاسق و فاجر خلیفہ کے غلام ہیں جسے امیر المومنین کہا کرتے تھے۔ جاحظ کہتا ہے: خلیفہ مولا و آقا ہے اور عوام اس کے غلام۔

یہ طرزِ فکر اسلامی حکومت سے انحراف کے بعد وجود میں آیا۔

بہرکیف طاغوتی حکومتوں کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ وہ عوام کو اپنا غلام سمجھتی ہیں ان کی نظروں میں عوام کا کوئی احترام نہیں عوام کا کوئی حق نہیں، نہ انھیں انتخاب کا حق، نہ اظہارِ خیال کا اور اگر بیعت بھی کرنی ہے تو صرف اس شخص کی جس کی بیعت کا خلیفہ یا طاقتور افراد حکم دیں۔ عوام بیعت کرنے پر مجبور ہیں۔

تیسرا نکتہ: ”و دین اللہ دخلاً“ طاغوتی حکمرانوں کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ دینِ خدا کو کھلونا بنا لیتے ہیں خدا کے دین میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ جب کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ عوام کو اپنا گرویدہ بنانے کے لیے اظہارِ دینداری کرتے ہیں۔ اسلام و قرآن کا نام لیتے ہیں با جماعت نماز ادا کرتے ہیں اور جب کبھی ضرورت ہوتی ہے تو اپنی انفرادی زندگی یا سماجی زندگی یا کسی کام میں یا صلح و جنگ کے موقع پر اسلام کو بڑے اطمینان سے پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ جس طرح سے چاہتے ہیں اسلام سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ درحقیقت اسلام ان کا ہادی و رہنما نہیں ہوتا بلکہ یہ لوگ جب اور جس طرح چاہتے ہیں اسلام کا رخ موڑ

دیتے ہیں۔ یہ چیز خلفائے بنی امیہ و بنی عباس میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اگر کوئی شخص پہلی اور دوسری صدی کے تاریک ایام اور اندوہناک حالات کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ آلِ ابی العاص کے متعلق پیغمبرِ اسلام نے "دین اللہ دخلاً" کی جو خبر دی تھی اس کا مطلب کیا ہے۔ جو دل چاہتا کرتے تھے، جعلی حدیثیں گھڑتے قرآنی آیات کی تلاوت پر پابندی لگا دیتے، آیات کی تفسیر جرم قرار دے دیتے، کہتے تھے کہ لوگ فلاں آیت کو پڑھیں اور فلاں طریقے سے معنی کریں، جیسی ضرورت پیش آتی ویسے معنی نکال لیتے۔ خلافت کے پر تکلف دسترخوان پر روٹی توڑنے والوں میں کچھ نام نہاد دینی شخصیات بھی تھیں۔ یہ منفعت پرست خدا فراموش لوگوں حکمرانوں کی مرضی کے مطابق قرآن کی تاویل و تفسیر کیا کرتے۔

یہی تین چیزیں تھیں جن کی خبر پیغمبر اکرمؐ نے آلِ ابی العاص کی متعلق دی تھی۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے فرمایا: جب آلِ ابی العاص کی تعداد تیس تک پہنچ جائے گی اس وقت وہ لوگ اس قسم کے اعمال انجام دیں گے:

اتخذوا عباد اللہ خولا و مال اللہ دولا و دین اللہ دخلا

اور یہی کچھ ہوا بھی۔ آلِ ابی العاص نے دنیائے اسلام کو ان مشکلات میں گرفتار کر دیا۔ حکومتِ الٰہی اور امانتِ امت جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے "ملون بامرنا"۔ ہمارے حکم سے لوگوں کی ہدایت کریں گے۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کریں گے، نماز قائم اور زکوۃ ادا کریں گے۔ اتنے اعلیٰ مفاہیم کی حامل حکومتِ الٰہی ایک ایسی طاغوتی سلطنت و حکومت میں بدل گئی کہ انسان میں جتنی زیادہ شقاوت و بربریت تصور کی جاسکتی ہے وہ سب ان سلاطین میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جتنی برائیاں خود جانتے تھے اور ایران و روم کے بادشاہوں سے دیکھتے تھے سب پر عمل کرتے تھے۔

مختصر یہ کہ اس قسم کے سنگین حالات پیدا ہو گئے تھے۔ ان حالات کے مقابلے میں کیا کرنا چاہیے؟

تاریخ کے سامنے یہ عظیم سوال تھا یہ ایسا حکم الٰہی تھا جس سے دنیائے اسلام ناآشنا تھی۔ اگر اسلامی معاشرے میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو مسلمان کو کیا کرنا چاہئے ان کا فریضہ کیا ہے؟

جس وقت حکومت امیر المومنینؑ کے ہاتھوں میں تھی آپ کا فریضہ یہ تھا کہ ایسے حالات پیدا نہ ہونے دیں۔ لہٰذا اسی مقصد کے لیے آپ جنگ کرتے رہے۔ جب تک حضرت علیؑ زندہ تھے کسی میں علانیہ فسق و فجور کی جرات نہ تھی بلکہ قرآن کا سہارا لیتے تھے۔ امیر المومنینؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ نے اپنے پدر بزرگوار کی سیرت کو باقی رکھا یہاں تک کہ جب آپ نے دیکھا کہ حضرت علیؑ کی مانند اقدام نہیں کر سکتے تو اپنی حکمت عملی بدلنے پر مجبور ہوئے کیونکہ امیر المومنینؑ کے پاس ایک بڑی فوج تھی، سپاہی جنگ کے لیے تیار تھے لیکن ایسی فوج امام حسنؑ کے پاس نہ تھی جو تھی وہ لڑنے کے لیے تیار نہ تھی دونوں کا مقصد ایک ہے صرف حکمت عملی کا فرق ہے۔

میں شاید اس سے پہلے بھی امام حسنؑ کی زندگی اور صلح کے متعلق گفتگو کر چکا ہوں اور اگر دوبارہ موقع ملا تو پھر کبھی بحث کروں گا اور ثابت کروں گا کہ امام حسنؑ نے اس دور میں جب کہ عوام ابھی آگاہ نہ تھے، وہ نہیں جانتے تھے کہ کتنی بڑی مصیبت ان کی گھات

میں ہے، ایسے حالات میں سب سے بہترین کام جو کیا جا سکتا تھا وہی امام حسن نے انجام دیا یعنی معاویہ سے صلح کی۔ اس کا مطلب صرف جنگ بندی تھا۔ یہ صلح ایک حکمت عملی تھی، خاص لوگ جانتے تھے کہ امام حسنؑ حالت سازگار بنانے کے لیے موقع کے منتظر تھے۔ امام حسنؑ نے دس برس تک کوشش کی اور کافی حد تک زمین ہموار کر لی مگر اسی عرصے میں آپ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور بارِ امامت امام حسینؑ کے کاندھوں پر آ گیا۔

امام حسینؑ نے بھی دس سال تک امام حسنؑ کی حکمت عملی پر عمل کیا لوگوں کا آگاہ کیا، تقریریں کیں، نزدیکی اصحاب کو ہدایات دیں، شیعوں کو متحد کیا، علماء و فقہا کو ان کے فرائض سے آگاہ کیا لیکن معاویہ کی موجودگی میں کوئی اقدام نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ حالات معاویہ کے زبردست کنٹرول میں تھے، امیر شام کی حیات میں امام حسینؑ کے لیے کوئی قدم اٹھانا ممکن نہ تھا۔

۶۰ ہجری میں امیر شام کے دنیا سے رخصت ہوتے ہی زمین ہموار ہوگئی۔ یعنی اب عوام آمادہ ہیں، ذہن کسی حد تک تیار ہیں، تمام باتیں کہی جا چکی ہیں اور یزید کی شخصیت بھی امیر شام جیسی نہیں، معاویہ نے کم از کم عصرِ رسولؐ کو دیکھا تھا، ظاہری اسلام کو کسی حد تک ملحوظ رکھتے تھے، پیغمبرؐ سے ان کی رشتہ داری بھی کچھ لوگوں کو ان کی طرف کھینچتی تھی۔ اسلام دشمنی کا کھلم کھلا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ فتح شام میں وہ اور ان کا بھائی شریک تھے اور وہیں پر انھوں نے پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ امیر شام نے شام کو اپنا مرکز بنا لیا تھا لیکن یزید میں یہ خصوصیات نہ تھیں عالم اسلام میں یزید کا کوئی اثر نہ تھا۔ یزید شراب نوش تھا، فاسد اور اعلانیہ فسق و فجور کا ارتکاب کرتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب حسینؑ جیسی شخصیت یزید کے مقابلے میں کھڑی ہو سکتی تھی۔ حسینؑ یہ کہہ سکتے تھے کہ میں یزید جیسے شخص کی بیعت نہیں کر سکتا۔ وہ ہرگز لائق خلافت نہیں اور یہی انکار بیعت ایک تحریک کا سبب بن جاتا، عوام اٹھ کھڑے ہوتے، عالمِ اسلام بیدار ہو جاتا، اسلامی نظام اپنی اصل صورت میں لوٹتا، سلطنت کو دوبارہ امامت میں بدل دیا جاتا۔ اس قسم کے حالات یزید کے دور میں آ چکے تھے، اسی مقام پر امام حسینؑ کی اہمیت نمایاں ہو جاتی ہے۔

البتہ یہ عرض کر دوں کہ اس تاریخی موقع پر ہمارے ائمہ واطہار علیہم السلام میں سے جو امام بھی ہوتا وہ وہی کچھ کرتا جو امام حسینؑ نے کیا۔ اگر یہی حالات امام حسنؑ، امام زین العابدینؑ، امام جعفر صادقؑ، امام علی نقیؑ، امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں پیش آتے تو وہ بھی یہی کرتے اور وہی امام سید الشہداء کا لقب پاتا لیکن یہ حالات صرف امام حسینؑ کے زمانے میں پیش آئے، پیغمبرِ اسلام پہلے سے اس کی خبر دے چکے تھے۔

میں اس مقام پر ایک نکتہ عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

تمام اسلامی احکام پر پیغمبرِ اکرمؐ نے خود عمل کر کے بتایا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر۔ پیغمبرِ اکرمؐ صرف یہ کہنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے کہ اے لوگو! نماز پڑھو بلکہ خود نماز پڑھ کر بتاتے تھے کہ اس طرح نماز پڑھو۔ صرف کہتے ہی نہیں تھے کہ جہاد کرو بلکہ آگے آگے خود ہوتے تھے اور دشمنوں سے جہاد کرتے تھے۔ حج بجا لا کر لوگوں کو حج کی تعلیم دی، امر بالمعروف کر کے بتایا کہ امر بالمعروف اس طرح کیا جاتا ہے قرآن پڑھ کر مسلمانوں کو تلاوتِ قرآن کی تعلیم دی۔ آپؐ جتنے احکام

مسلمانوں کو بتاتے تھے پہلے خود ان پر عمل کرتے تھے۔ اسلام کے تمام احکام پر پیغمبرِ اسلام کی حیات میں عمل ہو گیا تھا۔ صرف ایک حکم باقی رہ گیا تھا جس پر پیغمبرِ اکرمؐ کی زندگی میں عمل نہیں ہوا اور وہ حکم یہ تھا کہ اگر اسلامی تحریک جادۂ حق سے منحرف ہو جائے، اگر نظامِ اسلامی اپنے راستے سے ہٹ جائے، لا الہ الا اللہ کے بجائے مقصدِ بت و طاغوت ہو جائے تو اس وقت مسلمانوں کا کیا فریضہ ہے، یہ ایسی چیز تھی جس پر پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں عمل ممکن نہ تھا۔

طاغوتی حکومت میں مسلمانوں کے ذمہ داریاں

جب الٰہی و اسلامی امامت کے بجائے طاغوتی و شیطانی سلطنت قائم ہو جائے اس وقت مسلمانوں کی کیا ذمہ داریاں ہیں؟ یقیناً اسلام میں اس کا حکم موجود ہے، پیغمبرِ اسلام نے بھی ایسے حالات میں مسلمانوں کے فرائض بیان کیے ہیں، خود امام حسینؑ بھی پیغمبرِ اسلام سے روایت کرتے ہیں لیکن خود پیغمبرِ اسلام اس حکم پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں؟ اس لیے کہ خود پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں اس قسم کے حالات پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے، یہ حالات آپ کے برحق جانشینوں اور اوصیاء کے زمانے میں پیش آ سکتے تھے اور اس حکم کی عملی طور پر تبلیغ ان کے ذمہ تھی۔

امام حسنؑ کی زمانے میں پائی جانے والی دوسری خصوصیتوں سے آپ کا امتیاز یہی تھا۔ امام کے زمانے میں اور بھی بہت ہی لائق و قابلِ احترام شخصیات موجود تھیں۔ بہت سے ایسے افراد تھے جو امام حسین علیہ السلام کو کربلا جانے سے منع کر رہے تھے اور وہ ایسا امام حسینؑ سے محبت کی بنا پر کر رہے تھے جیسے جنابِ زینبؑ کے شوہر عبداللہ بن جعفر، ابنِ عمر، عبداللہ ابنِ عباس، آپ کے بھائی عمر ابنِ علی، پیغمبرِ اسلام کی زوجہ محترمہ امِ سلمٰی، اس کے علاوہ اور بہت سے افراد جو امام حسینؑ سے گفتگو کرتے تھے۔ آپ سے اظہارِ محبت کرتے تھے۔ وہ لوگ خود بھی معاویہ و یزید کے خلاف تھے لیکن امام حسینؑ کی تحریک سے راضی نہ تھے، نہ خود اس تحریک میں شامل ہونے کے لیے تیار تھے اور نہ امام حسینؑ کو اس تحریک کی اجازت دیتے تھے۔ امام حسینؑ میں اور ان لوگوں میں یہی فرق تھا۔ وہ لوگ صرف کہنا چاہتے تھے تحمل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگرچہ نہج البلاغہ اور دیگر تاریخی کتابوں کے مطابق عبداللہ ابنِ عباس اور امیر المومنین کے درمیان کچھ مسائل پیش آئے تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ عبداللہ ابنِ عباس امیر المومنین اور اہلِ بیتِ اطہارؑ کے وفادار تھے۔

عبداللہ ابنِ عباس کے حالاتِ زندگی کا جہاں تک میں نے مطالعہ کیا ہے چاہے وہ عاشورہ سے پہلے کے حالات ہوں یا عاشورہ کے بعد کے مجھے اس بات میں شک نہیں کہ عبداللہ ابنِ عباس اہل بیت و پیغمبرؐ کے محب اور ان کے مخالفوں کے مخالف تھے۔ وہ معاویہ کے خلاف تھے یزید سے انھیں نفرت تھی یزید کے بعد آنے والے خلفا کے مخالف تھے۔ ان کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔

عبداللہ ابنِ جعفر کو علم و تقویٰ میں عبداللہ ابنِ عباس کے ہم پلہ نہ تھے لیکن انھیں بھی امام حسینؑ سے محبت تھی وہ بھی آپ کو کسی مصیبت میں گرفتار نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

اسی طرح پیغمبرِ اسلام کی زوجہ امِ سلمیٰ بھی امام حسینؑ سے خاص لگاؤ رکھتی تھیں۔ ان سب کو امام حسینؑ سے عقیدت تھی لیکن یہ لوگ امام حسینؑ کی اس خاص تحریک کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

امام حسینؑ کی تحریک اس لیے تھی کہ اپنے زمانے کے اور آئندہ آنے والے زمانوں کے مسلمانوں کو یہ بتا دیں کہ جب کبھی اسلامی معاشرہ اور اس پر حاکم نظام ان حالات سے دو چار ہو جائے، جب کبھی مسلمان کی زمام کسی امام کے بجائے بادشاہ کے ہاتھ میں آ جائے تو ان پر فرض ہے کہ بادشاہ کے خلاف اس طاغوتی حکمران کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں ہر ممکن طریقے سے اقدام کریں۔ اگر تلوار اٹھانا ممکن ہے تو پھر زبانی مخالفت پر اکتفا کرنا حرام ہے۔ ایسی صورت میں سخت سے سخت اقدام واجب ہے چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ چاہے قتل ہی ہونا پڑے۔ یہی امام حسینؑ کا راستہ ہے امام حسینؑ کی تحریک کا مقصد مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری یاد دلانا تھا۔

کچھ عرصے قبل محققین اور دانشوروں کے درمیان یہ بحث چھڑی تھی کہ امام حسینؑ کی تحریک کا مقصد کیا تھا۔

کچھ لوگ کہتے تھے کہ امام حسینؑ نے حکومت کے قیام کے لیے تحریک چلائی تھی امام حسینؑ کا مقصد یہ تھا کہ عراق جا کر اپنی من پسند حکومت تشکیل دیں لہذا جب راستے میں آپ کو یہ خبر ملی کہ عراق میں حکومت کی تشکیل کا امکان نہیں رہا ہے کوفیوں نے بے وفائی کی ہے تو آپ نے مدینہ واپس ہونے کا ارادہ کیا۔ حضرت شہید نہیں ہونا چاہتے تھے آپ کو مجبور کر کے کربلا لے جایا گیا اور وہاں شہید کر دیا گیا۔ یہ بعض لوگوں کا قائم کردہ ایک نظریہ ہے جسے کچھ لوگ قبول بھی کرتے تھے۔

اس نظریے کے مقابلے میں بعض لوگ دوسرا نظریہ رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ کا مقصد حکومت نہ تھا بلکہ وہ صرف شہید ہونا چاہتے تھے۔ آپ نے مدینہ سے سفر کیا تا کہ کربلا آ کر شہید ہو جائیں۔ آپ کہتے تھے کہ اگر میں زندہ رہ کر اس نظام کے خلاف جدوجہد نہیں کر سکتا تو پھر بہتر ہے کہ شہید ہو جاؤں اور اپنی شہادت کے ذریعے اس نظام کو نیست و نابود کر دوں۔

جب ہم کربلا کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ امام حسینؑ کا مقصد نہ تو حکومت کی تشکیل تھا اور نہ شہادت۔ ظالم و جابر حکمران کے خلاف آپ کے علمِ جہاد بلند کرنے کا مقصد لوگوں کو سخت ترین حالات میں اپنے دینی فریضے کی بجا آوری اور ظلم و ستم کے خلاف جہاد و مبارزے کی تعلیم دینا تھا۔ امام حسینؑ نے اپنے اس اقدام سے دنیا کو بتا دیا کہ اس طرح کے اقدام میں خواہ شہادت کا امکان ہو یا کامیابی کا بہر صورت یہ اقدام ہر چیز سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حسینیؑ تحریک وضاحت کی محتاج نہیں

حسینیؑ تحریک اپنا مقصد خود بتاتی ہے۔ امام حسینؑ کے کلمات اب بھی تاریخ میں موجود ہیں۔ آپ نے مختلف مواقع پر اپنے دوستوں، دشمنوں، غیر جانب داروں، محصوبوں، ساتھیوں اور گمراہوں کو خطاب کر کے اپنے مقصد کی وضاحت فرمائی ہے۔ میں امام

حسینؑ کے بعض کلمات پیش کرتا ہوں جن سے واقعاتِ کربلا پر روشنی پڑتی ہے۔

اس زمانے میں علمائے اسلام کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔علماء سے ہماری مراد وہ افراد ہیں جو اصحاب رسولؐ تھے، پیغمبرِ اکرمؐ کی احادیث خود پیغمبرِ اکرمؐ کی زبانی یا دوسروں کے وسیلے سے سنے ہوئے تھے۔احادیث نقل کرتے تھے، ان لوگوں کو عوام علمائے دین کی حیثیت سے احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ان میں سے کچھ افراد کو حسین ابن علیؑ نے منیٰ میں اکٹھا کر کے ایک مفصل خطاب فرمایا۔یہ خطاب تحف العقول اور دیگر کتابوں میں موجود ہے۔خطاب کے اختتام پر آپ نے آسمان کی جانب رخ کیا اور فرمایا۔

''خدایا! تو جانتا ہے کہ میری اس تحریک کا مقصد وہ نہیں ہے جو عام دنیا پرست حکمرانوں کا ہوا کرتا ہے۔میرا مقصد حکومت و اقتدار کا حصول نہیں ہے۔میرا مقصد دنیوی فضول حطام حاصل کرنا نہیں ہے (فضول حطام ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جو انسان کی معمولی زندگی سے زائد ہوں جیسے فاخرہ لباس، عمدہ مکانات، بہترین سواری، پُر تکلف دسترخوان، رنگ برنگے کھانے، عیش و عشرت، یہ سب فضول حطام ہیں) میری تحریک کا مقصد عوام کو دین کی چھپی ہوئی نشانیوں سے واقف کرنا ہے۔قرآن اور اسلامی اصول واقدار، اہداف ومقاصد کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔میرا مقصد عوام میں ان چیزوں کی نمود ہے۔

پروردگارا! ہم تیرے شہروں اور تیری سرزمین کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں اسلامی معاشرے کو آباد کرنا چاہتے ہیں۔اس ظلم و ستم، اس طبقاتی اختلاف، فقر کی شدید غربت اور امیروں کی شکم پری اور پرخوری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ظلم اور بے جا امتیازات کو مٹانا چاہتے ہیں۔ہمارا مقصد انہی چیزوں کی اصلاح ہے۔

ہماری تحریک تیرے ستم رسیدہ اور مظلوم بندوں کی نجات کی خاطر ہے۔ان کے تحفظ اور آسائش کی خاطر ہے۔(کیونکہ اس زمانے میں اگر کوئی شخص حکمرانوں کی نفسانی خواہشات اور ہوا و ہوس کے خلاف معمولی سا اعتراض بھی کرتا تھا تو اسے سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔)''

امام حسین نے یہ باتیں منیٰ میں علماء، فقہا، محدثین اور قاریانِ قرآن کے روبرو کہیں اور واضح الفاظ میں اپنے مقصد کو بیان فرمایا: معاویہ کی موت کے بعد حاکمِ مدینہ ولید ابن عتبہ نے جب امام حسینؑ کے پاس پیغام بھیج کر آپ کو دارالامارہ میں طلب کیا تو حضرت نے فوراً ہی کچھ لوگوں کو اکٹھا کیا۔عبداللہ ابن زبیر اور مدینہ کی دوسری اہم شخصیتوں کو جمع کر کے کہا کہ شاید معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ہم لوگوں کو بیعت کے لیے بلایا گیا ہے۔لہذا حضرت تیاری کے ساتھ دارالامارہ تشریف لے گئے۔ولید بن عتبہ کا مقصد تھا بھی یہی اس نے امام حسین کو بیعت ہی کے لیے بلایا تھا۔

دارالامارہ میں حجاز کا گورنر ولید ابن عتبہ اور مروان بن حکم موجود تھے۔ان لوگوں نے حضرت امام حسینؑ سے بیعت طلب کی۔حضرت نے بات کو ٹالنا چاہا۔فرمایا: صبح ہونے دو اس وقت دیکھیں گے کہ کیا کرنا چاہیے اور بیعت تو بھرے مجمع میں ہونی چاہیے۔

امام نے دارالامارۃ سے جانا چاہا لیکن مروان نے ولید کو اشارہ کیا کہ تم حسینؑ کو جانے دے رہے ہو۔اگر اس وقت حسینؑ چلے گئے تو پھر تمھارے ہاتھ نہ لگیں گے بہتر ہے کہ اسی وقت ان پر دباؤ ڈال کر بیعت لے لو۔

امام حسینؑ کا پختہ عزم

امام حسینؑ نے مروان کی طرف رخ کر کے سخت لہجے میں فرمایا: تم مجھ سے زبردستی بیعت لینا چاہتے ہو۔ کیا تم میں یا ولید میں اتنی جرات ہے؟ خدا کی قسم تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے۔ مطمئن رہو۔ میرے جیسا یزید جیسے کی بیعت ہرگز نہیں کر سکتا۔

حضرت اس موقع کو گنوانا نہیں چاہتے تھے، آپ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ صحیح و سالم مکہ پہنچنا چاہتے تھے تاکہ وہاں پہنچ کر اس عظیم تحریک کو شروع کریں۔ اسی لیے حضرت نے دارالامارہ سے واپس آتے ہی راتوں رات مدینہ چھوڑ دیا۔

ایک موقع پر مروان کو خطاب کر کے حضرت نے یزید کے متعلق کچھ گفتگو کی۔ جب مروان نے یہ کہا کہ حسینؑ ابن علیؑ! میرا مشورہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیں اور اپنے آپ کو پریشانی میں مبتلا نہ کریں۔

حضرت نے جواب میں فرمایا: جس دن عوام یزید جیسے راعی کے ہاتھ میں گرفتار ہو جائیں (یعنی بھیڑ بکریاں بھیڑیوں کے پنجے میں اسیر ہو جائیں) اس دن اسلام کی بربادی یقینی ہے۔ اسلام کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ان کلمات سے پتہ چلتا ہے کہ حسینؑ ابن علیؑ کا مقصد احیائے اسلام تھا مدینہ سے نکلتے وقت حضرت نے محمد بن حنفیہ سے وصیت کے عنوان سے فرمایا:

میرے خروج و تحریک کا محرک (ابھی حضرت مکہ نہیں پہنچے تھے یہ جملے مدینہ سے نکلتے وقت فرماتے ہیں لیکن اسی میں قیام و تحریک و خروج کا تذکرہ ہے یہاں حرم پیغمبر میں پناہ لینے کا تذکرہ نہیں ہے۔ ورنہ لفظ خروج استعمال نہ فرماتے) تکبر، خودخواہی، انانیت، ہوسِ اقتدار اور وہ چیزیں نہیں ہیں جو عام طور پر ستم گروں، مفسدوں اور ظالموں کا مقصد ہوا کرتی ہیں۔ ہم نے فتنہ و فساد کی غرض سے خروج نہیں کیا ہے ہمارے قیام و خروج کا مقصد امتِ جد کی اصلاح ہے۔ (امتِ جد بیمار ہے اسے طبیب کی ضرورت ہے عالمِ اسلام میں برائیاں رچ بس گئی ہیں ان برائیوں کو اپنی تحریک کے ذریعے دور کروں گا۔) میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے جد اور اپنے باپ کی سیرت پر عمل کرنا چاہتا ہوں (یعنی اسلامی امامت و الٰہی حاکمیت کو معاشرے میں دوبارہ قائم کرنا چاہتا ہوں)۔

امام حسینؑ نے متعدد مقامات پر خطبے دے کر اپنے مقصد کی وضاحت کی ہے۔ اگر وقت ہوتا تو میں ان تمام خطبات کو آپ کی خدمت میں پیش کرتا لیکن وقت کی کمی کے پیشِ نظر صرف ایک خطبے پر روشنی ڈالوں گا۔

حضرت نے اپنے مقصد کی وضاحت خاص طور پر اس خطبے میں فرمائی تھی جو آپ نے حر اور اس کے لشکر کے ایک ہزار سپاہیوں کے سامنے ارشاد فرمایا تھا۔

شائد حر سے آپ کا پہلی مرتبہ آمنا سامنا منزلِ شراف پر ہوا۔ اس وقت آپ نے خطبہ دیا۔ لشکرِ حر کو یاد دہانی کرائی کیونکہ وہ

اہل عراق واہل کوفہ تھے۔ انھیں یاد دلایا کہ تم ہی نے ہمیں دعوت دی تھی۔ تم ہی نے پیغام بھیجے تھے کہ میں یہاں آ کر اسلامی والٰہی حکومت تشکیل دوں اسلام کو زندہ کروں اور احیائے اسلام میں تمھارا ساتھ دوں تم اپنے وعدوں سے کیوں پھر گئے ہو؟

دوسری یا تیسری منزل پر حضرت نے پھر تقریر فرمائی جو اس مضمون پر مشتمل تھی: ”اے لوگو! جو ہمارے ہمراہ ہو اور ہماری تحریک کا مقصد جاننا چاہتے ہو۔ اے لوگو! جو آج ہمارے دشمن کی حیثیت سے ہمارے مقابلے میں کھڑے ہوئے ہو۔ اے وہ بے خبر و غیر جانبدار افراد، جنھیں قیامِ حسینی کی خبر ملے گی مگر یہ معلوم نہ ہوگا کہ فرزندِ پیغمبر نے کیوں قیام کیا ان کی تحریک کا مقصد کیا تھا اور اے وہ لوگوں، جو اسلامی تعلیمات و احکام کو سمجھنا چاہتے ہو۔ لیکن ہمارے قیام کا مقصد نہیں معلوم! جان لو کہ میں جو کچھ کہتا ہوں اپنے پاس سے نہیں کہتا، اپنا ذاتی نظریہ بیان نہیں کرتا میں وہی حسینؑ ہوں جو حکمِ پیغمبر کو عملی جامہ پہنا رہا ہے حکمِ پیغمبر یہ ہے کہ جب کبھی دیکھو کہ معاشرے کی باگ ڈور ظالم اور ستم گر ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے۔ ظالم و ستم گر حکمران عوام سے بدسلوکی کر رہا ہے، ان پر ظلم وستم ڈھا رہا ہے، عوام کے مفادات اس کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے اسے صرف اپنے مفادات سے مطلب ہے۔ جب کبھی ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اگر کوئی شخص ان حالات کو دیکھ کر ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھائے قیام نہ کرے تو خداوندِ عالم کو حق ہے کہ قیامت کے دن اسے بھی وہی سزا دے جو اس ظالم حکمران کی سزا ہے۔“

ہمارے اسلامی انقلاب کا محرک بھی یہی تھا اس گھٹن کے دور میں جن لوگوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جہاد کیا ظلم کے خلاف آواز اٹھائی مصیبت برداشت کی قید کی سختیاں جھیلیں، دار و رسن کو گلے لگایا، جامِ شہادت نوش کیا، ان کا محرک بھی یہی تھا پیغمبرِ اسلام کی وہی حدیث جسے حسین ابن علیؑ نے بیان فرمایا۔ آج بھی مسلمانانِ عالم کا یہی فریضہ ہے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہتے ہوں اگر وہ اپنے فرائض سے پہلوتہی کریں گے تو خداوندِ عالم کی نظر میں وہ ظالم اور یہ خاموش و لاپرواہ افراد ایک ہی صف میں شمار کیے جائیں گے۔

آج خونِ آشام توسیع پسندوں کے مقابلے میں ہمارا بھی یہی فریضہ ہے، ابھی ہمارا جہاد ختم نہیں ہوا ہے۔ ہم اپنے معاشرے میں حسینی تحریک کو ختم شدہ تصور نہیں کرتے۔ ہم اب بھی کربلا و عاشورا کے راستے پر گامزن ہیں ہماری قوم میں اب بھی یہ احساس ہونا چاہیے کہ ہم میدانِ کربلا میں کھڑے ہیں۔

مسلمانوں کی تحریک کی روح یہی ہے۔ جہاں کہیں اسلامی تعلیمات کی بقا، عدلِ الٰہی کے قیام اور احیائے اسلام کے لیے کوئی تحریک شروع ہوتی ہے وہ حسینی تحریک ہوتی ہے۔ جو لوگ فلسطین کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں وہ دراصل امام حسینؑ کی تاسی کر رہے ہیں، جس وقت فلسطینیوں کے پاس شجاع و مجاہد قائد موجود تھے ان قائدوں کا کہنا تھا اور حقیقت بھی یہی تھی کہ ہم روحِ کربلا، روحِ عاشورا اور راہِ حسینؑ سے الہام حاصل کر رہے ہیں، ہم حسینی تحریک سے سبق حاصل کر رہے ہیں، دنیا کے جس کسی گوشے میں اسی طرح کی تحریک رونما ہو وہ پیغامِ حسینی کا پرتو ہے۔

حسین ابن علیؑ نے انہی مقاصد کے لیے یہ قدم اٹھایا۔ حسینؑ نے مدینہ سے مکہ کا سفر طے کیا چند ماہ مکہ میں گزارے پھر مکہ سے کربلا پہنچے۔ اس عرصے میں کہیں پر بھی امام حسینؑ نے مدافعانہ پہلو اختیار نہیں کیا۔ جس کسی نے پوچھا اس کی استعداد کے مطابق

اپنے مقصد کی وضاحت کی۔ اگر کسی کمزور دل شخص نے پوچھا جیسے فرزدق شاعر جسے امام حسینؑ سے لگاؤ ضرور تھا لیکن آپ کی رکاب میں جنگ کی ہمت نہ تھی یا جیسے حضرت ام سلمیٰ آپ ضعیف العمر ہو چکی تھیں آپ کو تسکین کرنا مناسب نہ تھا یا محمد حنفیہ جس وقت مکہ میں دوسری مرتبہ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں بیمار تھے۔ شاید اگر بیمار نہ ہوتے تو امام حسینؑ کے ہمراہ ہوتے۔ مذکورہ تمام لوگوں کو امام حسینؑ نے دوسرے انداز سے جواب دیا ہے۔

جن لوگوں میں سخت جواب سننے کی طاقت نہیں تھی انھیں اجمالی طور پر اپنے مقصد سے آگاہ کر دیا۔ مثلاً فرمایا کہ جو خدا کی مرضی ہے وہی ہوگا، ہم نے خود کو ہر قسم کے حوادث کے لیے تیار کر لیا ہے، اللہ مالک ہے اس طرح کے جوابات دیئے۔

جس شخص میں سننے کی طاقت موجود تھی اور اسے بتانا ضروری تھا اسے حضرت نے نہایت واضح اور صریح الفاظ میں اپنا مقصد بتایا حتیٰ کہ جس وقت امام حسینؑ مکہ چھوڑ کر جا رہے تھے اور عبداللہ بن جعفر مدینہ کے گورنر سعید بن عاص (ولید ابن عتبہ کو امام حسینؑ سے بیعت لینے میں سستی کرنے کے جرم میں گورنری سے برطرف کر کے سعید بن عاص کو گورنر بنا دیا گیا تھا) سے جو اس وقت مکہ میں موجود تھے امان نامہ حاصل کر کے گورنر کے بھائی کے ہمراہ امام حسینؑ کی خدمت میں آئے ہیں اور امام حسینؑ سے درخواست کی ہے کہ آپ مکہ سے نہ جائیں فی الحال یہیں سکونت اختیار کر لیں اس مقام پر حضرت نے مکمل عزم کے ساتھ سخت لہجے میں گفتگو کی اور فرمایا: امان خدا کی امان ہے خدا کی امان میں رہنے والے کو کسی غیر کے امان نامے کی ضرورت نہیں۔

حتیٰ کہ جب آپ کربلا میں پہنچ چکے تھے (اور عمر سعد بظاہر چوتھی محرم کو کربلا میں داخل ہوا ہے) ان ایام کے دوران تک عمر سعد اور امام حسینؑ کے درمیان گفتگو جاری رہی، عمر سعد امام حسینؑ کے خیمے میں آکر آپ سے گفتگو کرتا تھا۔ ایک گفتگو میں امام حسینؑ نے عمر سعد سے ایک جملہ کہا۔ پہلے آپ حالات کا جائزہ لیں کہ امام حسینؑ نے کن حالات میں یہ بات کہی ہے۔ امام حسینؑ وہ شخص ہیں جنھوں نے قیام کیا ہے اور اب بیابان میں محاصرے میں لیے جا چکے ہیں۔ ظاہری طور پر حالات یہ ہیں کہ حضرت ستر اسی افراد کے ہمراہ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں میدانِ کربلا میں محصور ہو چکے ہیں ہزاروں مسلح افراد کے نرغے میں ہیں جو چلو بھر پانی کے بدلے انسانیت کا خون بہانے پر کمر بستہ ہیں وہی وحشی جانور درندے، بھیڑیئے، جن کے ہاتھوں میں نیزے بھی ہیں اور تلواریں بھی اس قسم کے لوگوں نے امام حسینؑ کا محاصرہ کر رکھا ہے، ہم جانتے ہیں کہ ایسے حالات میں محاصرہ شدہ انسان کس انداز میں گفتگو کرتا ہے۔ ظاہری طور پر فاتح لشکر کا کمانڈر امام حسینؑ کے خیمے میں آتا ہے ان دونوں کے درمیان کس قسم کی گفتگو ہوگی۔ ظاہراً تو ہونا یہ چاہیے کہ وہ امام حسینؑ سے احتجاج کرے کہ حضرت آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟ حضرت بھی جواب دیں کہ بھائی جو کچھ ہونا تھا ہو چکا لیکن اب کوئی راستہ نکالنا چاہیے لیکن اس کے برعکس جب عمر سعد خیمے میں آتا ہے تو آپ فرماتے ہیں: تم ہمارا ساتھ کیوں نہیں دیتے، ہماری تحریک میں شامل کیوں نہیں ہوتے۔ وہ کہتا ہے: میرے بال بچے وہاں ہیں میں پھنس جاؤں گا۔ حضرت فرماتے ہیں: پھر چلے جاؤ ہم سے جنگ نہ کرنا ابن زیاد کی اطاعت نہ کرو۔ وہ کہتا ہے: میں ڈرتا ہوں ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھ پر حملہ ہو جائے گا میرا مال لٹ جائے گا۔ اس پر حضرت اعتراض کرتے ہیں اور وہ عذر پیش کرتا ہے۔

امام حسینؑ اور عشق الٰہی کے جلوے

ثاقب اکبرؒ

امام حسینؑ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے حکیم الامت علامہ اقبال نے انھیں امام عاشقاں قرار دیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

آں امام عاشقاں پور بتول
سروِ آزادے زبستان رسولؐ[1]

علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں عشق کو بہت اہمیت دی ہے اور شاید عشق ہی کو ان کی شاعری کا لب لباب قرار دیا جا سکتا ہے لیکن امام عاشقاں آپ نے حضرت امام حسینؑ ہی کو قرار دیا ہے۔ اس کی حقیقت جاننے کے لیے ہمیں امام حسینؑ کی زندگی کا قریب سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ عشق الٰہی امام حسینؑ کی پوری زندگی میں جلوہ گر ہے اور کربلا میں یہ جلوے اپنی معراج کو پہنچتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ روز عاشورا بھی جوں جوں وقت آگے کی طرف بڑھتا تھا روایات کے مطابق آپ کے چہرے پر رونق، بشاشت اور جلال و جمال کی تجلیاں زیادہ ہویدا ہوتی چلی جاتی تھیں۔ اسی حقیقت جاننے کے لیے ہم نے امام حسینؑ کی زندگی پر ایک نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

کان میں رسول اللہؐ کی اذان و اقامت

امام حسینؑ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ آپ کی پیدائش پر آپ کے بھائی امام حسن کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی جیسا کہ حضرت اسماء بنت عمیس سے روایت ہے:

امام حسنؑ کی ولادت کے ایک سال بعد امام حسینؑ پیدا ہوئے، رسول اللہؐ کو خبر ہوئی تو آپ اپنی بیٹی حضرت فاطمہؑ زہرا کے گھر تشریف لائے اور فرمایا: میرے بیٹے کو لاؤ۔ حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں سفید پارچے میں لپیٹے حسین کو لے کر آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ نواسے کے چہرے پر نظر پڑی تو رسول اللہؐ خوش ہو گئے۔ پھر آپ نے آپ کے دائیں کان میں اذان اور بائیں

---

[1]۔ اقبال، محمد، کلیات اقبال فارسی (شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز لاہور، فروری ۱۹۷۳) ص ۱۱۰

میں اقامت کہی۔ اُس کے بعد آپ نے حسینؑ کو گود میں لیا اور گریہ کرنے لگے۔ میں نے عرض کی: میرے ماں باپ آپ پر فدا یا رسول اللہ! آپ کیوں گریہ کررہے ہیں؟ فرمایا: میرے رونے کی وجہ وہ مصائب ہیں جو میرے بعد اس نومولود پر وارد ہوں گے ،جلد وہ وقت آئے گا جب ظالم اسے قتل کردیں گے اور ان قاتلوں کو اللہ کے حضور میری شفاعت نصیب نہ ہوگی۔[1]

عام طور پر مسلمانوں میں نبی کریمؐ کی اس سنت کی وجہ سے ہی رواج ہے کہ بچے کی پیدائش پر کسی بزرگ یا خاندان کے کسی صالح فرد سے خواہش کی جاتی ہے کہ بچے کے کانوں میں اذان واقامت کہے تاکہ اللہ کی کبریائی، اس کی وحدانیت کی شہادت اور پیغمبر اکرمؐ کی رسالت کی گواہی کی آواز سن کر وہ اپنی زندگی کا آغاز کرے۔ رسول اللہؐ سے بہتر کسی شخصیت کا تصور نہیں کیا جاسکتا کہ جو کسی نومولود کے کانوں میں اذان واقامت کہے۔ یقیناً آپؐ کے ادا کردہ کلمات کی تاثیر بھی ہر کسی سے بڑھ کر ہے۔ یہ تاثیر امام حسینؑ کی پوری زندگی میں آخری لمحے تک دکھائی دیتی ہے۔ آپ کی حیات کا لمحہ لمحہ اللہ کی عظمت کے احساس اور اس کے سامنے اظہار عبودیت میں مستغرق دکھائی دیتا ہے۔

سات بار تکبیر

امام باقرؑ سے روایت ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے عام بچوں کی نسبت سے دیر سے گفتگو کرنا شروع کی۔ لوگوں کو خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپؑ بات ہی نہ کریں۔ ایک روز رسول اللہؐ نماز پڑھنے کے لیے تشریف لائے تو امام حسینؑ کو آپؐ نے اپنے کندھے پر اٹھایا ہوا تھا۔ لوگ نماز کے لیے آنحضرتؐ کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ آپؐ نے امام حسینؑ کو اپنی دائیں طرف زمین پر کھڑا کردیا۔ پھر آپؐ نے نماز کے لیے تکبیر کہی تو امام حسینؑ نے بھی تکبیر کہی۔ رسول اللہؐ نے امام حسینؑ سے تکبیر سنی تو دوبارہ تکبیر کہی، امام حسینؑ نے بھی تکبیر کہی یہاں تک کہ سات بار تکبیر کہی۔ یوں نماز کی ابتدا میں سات بار تکبیر کہنا سنت قرار پائی۔[2]

گویا امام حسینؑ نے جو پہلا کلمہ سنا وہ بھی ''اللہ اکبر'' تھا جو رسول اللہؐ کی زبان مبارک سے نکلا تھا اور جو پہلا کلمہ ادا کیا وہ بھی ''اللہ اکبر'' تھا جو رسول اللہؐ کی تاسی میں مسجد نبوی میں ادا فرمایا۔

ہر روز ہزار رکعت نماز

امام حسینؑ کو عبادت الٰہی سے بے پناہ عشق تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی نے امام علی ابن حسینؑ سے پوچھا: اے فرزند رسول! آپ کے والد کی اولاد کم کیوں ہے تو آپ نے فرمایا: مجھے تو اس بات کی حیرت ہے کہ میں کیونکر پیدا ہوگیا ہوں جبکہ میرے

---

[1]۔ شیخ طوسی، الامالی، ص ۳۶۷

[2]۔ ابن شہر آشوب، ج ۳، ص ۱۷۹ (البتہ بعض روایات کے مطابق یہ واقعہ امام حسنؑ کے متعلق ہے۔)

والدروز وشب میں ایک ہزار رکعت نماز ادا کرتے تھے۔[1]

وضو کرتے ہوئے امام حسینؑ کی حالت

روایت میں آیا ہے:

کان الحسین بن علی علیه السلام اذا توضاء تغیر لونه وارتعدت مفاصله فقیل له فی ذلک، فقال: حق لمن وقف بین یدک الملک الجبار ان یصفر لونه وترتعد مفاصله۔

حسین ابن علیؑ جب وضو کرنے لگتے تو آپ کا رنگ متغیر ہوجاتا اور آپ کی ٹانگیں لرزنے لگتیں۔ آپ سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو آپؑ نے کہا: جو شخص مالک جبار کے حضور کھڑا ہو اُس کے لیے یہی مناسب ہے کہ اُس کا رنگ زرد پڑ جائے اور اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔[2]

طولانی رکوع وسجود

امام حسینؑ طویل رکوع وسجود کیا کرتے تھے جیسا کہ ابوالقاسم حضرت مہدیؑ کا فرمان ہے کہ میرے دادا حسینؑ کے سجود و رکوع طولانی ہوتے تھے۔[3]

طلب باراں اور مقبولیت دعا

امام سجادؑ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ اہل کوفہ امام علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ بہت عرصے سے بارش نہیں برسی، آپ اللہ سے ہمارے لیے بارش کی دعا کریں۔ امیرالمومنینؑ نے امام حسین سے فرمایا: اٹھیں اور اللہ سے بارش کی دعا کریں۔ امام حسینؑ اٹھے اور اللہ کی بارگاہ میں یوں دعا کی:

بار الہا! اے بھلائیاں عطا کرنے والے اور برکتیں نازل کرنے والے! ہم پر خوب بارش برسا، ایسی بارش جو بھرپور ہو، جس سے زمین سرشار ہوجائے اور مسلسل برسنے والی ہو اور زمین کے اندر اتر جانے والی ہو اور اس کے ذریعے سے تو اپنے بندوں کی ناتوانی کو دور کردے اور مردہ زمین کو پھر سے زندہ کردے۔ آمین یارب العالمین۔

۱۔ بحارالانوار، ج ۸۲، ص ۳۱۱

۲۔ جامع الاخبار، ص ۷۶

۳۔ نفس المھموم، ص ۱۰۴

ابھی آپ نے دعا ختم نہ کی تھی کہ تیز بارش برسنے لگی۔ ایک بادیہ نشین عرب جو کوفہ کے نواح سے پہنچا تھا کہنے لگا کہ ایسی بارش دیکھ کر آیا ہوں کہ جس سے درے اور نشیب بھر گئے ہیں، اس طرح سے کہ پانی ان میں موج در موج دکھائی دے رہا ہے۔[1]

یوم عرفہ کی دعا

امام حسینؑ کی ایک نہایت ایمان افروز دعا ہے جو ''دعائے یوم عرفہ'' کے نام سے مشہور ہے۔[2] یہ دعا آپ نے مقام عرفات میں پڑھی تھی۔ اسے بشر بن غالب اور بشیر بن غالب نے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> عرفہ کے دن ہم مقام عرفات میں امام حسینؑ کی خدمت میں تھے، امام حسینؑ اس دن اپنے خیمے سے باہر نکلے، آپ کی اولاد میں سے بھی چند افراد آپ کے ساتھ تھے اور آپ کے اہل بیت اور مومنین کی ایک جماعت بھی ہمراہ تھی۔ آپ پر خضوع و خشوع کی ایک کیفیت طاری تھی۔ آپ نے عرفات کے پہاڑ کی بائیں جانب ٹھہر کر اپنے چہرہ مبارک کو خانۂ کعبہ کی طرف کر کے اپنے ہاتھوں کو اس طرح سے پھیلایا جیسے کوئی مسکین کسی سے کھانا مانگنے کے لیے پھیلاتا ہے اور اسی حالت میں یہ دعا شروع کی۔

اس میں توحید پرستی کا عجیب کمال دکھائی دیتا ہے۔ اس میں ایسے کلمات موجود ہیں کہ جو ایک حقیقی عارف باللہ ہی کی زبان سے ادا ہو سکتے ہیں۔ یہ دعا یہاں سے شروع ہوتی ہے:

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ الَّذِیْ لَیْسَ لِقَضَآئِهٖ دَافِعٌ وَلَا لِعَطَآئِهٖ مَانِعٌ وَلَا کَصُنْعِهٖ صُنْعُ صَانِعٍ هُوَ الْجَوَادُ الْوَاسِعُ فَطَرَ اَجْنَاسَ الْبَدَآئِعِ وَ اَتْقَنَ بِحِکْمَتِهِ الصَّنَائِعَ لَا تَخْفٰی عَلَیْهِ الطَّلَائِعُ وَلَا یَضِیْعُ عِنْدَهُ الْوَدَآئِعُ۔۔۔

راوی کہتے ہیں:

دعا مانگتے مانگتے ایک مقام پر پہنچ کر آپ نے اپنا سر آسمان کی طرف بلند کیا۔ آپ کی آنکھوں سے آنسو یوں رواں تھے جیسے دو مشکیں چہرے پر جاری ہوں۔ آپ بلند آواز سے اپنے پروردگار کو پکار رہے تھے:

یَا اَسْمَعَ السَّامِعِیْنَ وَ یَا اَبْصَرَ النَّاظِرِیْنَ وَیَا اَسْرَعَ الْحَاسِبِیْنَ وَیَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِ مُحَمَّدِ السَّادَةِ الْمَیَامِیْنَ وَاَسْئَلُکَ اَللّٰهُمَّ حَاجَتِیَ الَّتِیْ اِنْ اَعْطَیْتَنِیْهَا لَمْ یَضُرَّنِیْ مَامَنَعْتَنِیْ وَاِنْ مَنَعْتَنِیْهَا لَمْ یَنْفَعْنِی مَا اَعْطَیْتَنِیْ۔۔۔

جب آپ یارب یارب کہتے تو بار بار اس کا تکرار کرتے جو لوگ آپ کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے وہ

۱۔ موسوعہ کلمات الامام الحسین، ص ۳۳

۲۔ مجلسی، بحار الانوار، ج ۹۵، ص ۲۲۶ (ابن طاؤس کی کتاب ''اقبال الاعمال'' میں ''یارب'' تک ہے۔)

فقط دعا کو سن رہے تھے اور آمین کہتے جاتے تھے۔ اُن سب کے رونے کی آوازیں بھی آپ کے گریہ کے ساتھ بلند ہو رہی تھیں۔ اس حالت میں آپ وہاں غروب آفتاب تک رہے اور جب سورج غروب ہو چکا تو آپ وہاں سے مشعر الحرام کی طرف روانہ ہو گئے۔

جس نے تجھے گنوادیا۔۔۔

اسی دعا میں امام حسینؑ کے ایک جملے نے عالم گیر شہرت حاصل کی ہے۔ آپ بارگاہ ایزدی میں عرض کرتے ہیں:

ماذا وجد من فقدک و ما الذی فقد من وجدک لقد خاب من رضی دونک بدلا

اُس نے کچھ نہیں پایا جس نے تجھے کھو دیا اور اُس نے کچھ نہیں گنوایا جس نے تجھے پا لیا اور جو تیرے بدلے کسی اور پر راضی ہو گیا حقیقت یہ ہے کہ وہ محروم رہا۔

عبداللہ ابن زبیر کی گواہی

امام حسینؑ کی شہادت کی خبر حضرت عبداللہ ابن زبیر تک پہنچی تو آپ کہنے لگے:

اما واللہ لقد قتلوہ و کان طویلا باللیل قیامہ، کثیرا فی النہار صیامہ۔[۱]

واللہ ان لوگوں نے اُس شخص کو قتل کر دیا ہے جو راتوں کو عبادت الٰہی کے لیے طویل قیام کرتا تھا اور دن کو اکثر روزے سے رہتا تھا۔

ابن عبدالبر کی شہادت

معروف مورخ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

کان الحسین رضی اللہ عنہ فاضلا دینا۔ کثیر الصوم و الصلاۃ و الحج۔[۲]

امام حسین رضی اللہ عنہ دین کے لحاظ سے صاحب فضل تھے، آپ کثرت سے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور صدقہ اور دیگر تمام افعال خیر انجام دیتے تھے۔

۱۔ طبری، تاریخ طبری، ج ۴، ص ۳۶۴، ابن اثیر، الکامل فی التاریخ، ج ۴، ص ۹۹

۲۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب، ج ۱، ص ۳۹۳

عبادت کے لیے ایک رات کی مہلت

امام حسینؑ کو عبادت الٰہی کا بے حد اشتیاق تھا یہاں تک کہ جب نویں محرم کا دن ڈھلنے کو تھا تو فوج اشقیا کو حملے کا حکم ہوا۔ جب وہ خیام حسینی کے قریب پہنچے تو امام حسینؑ کی ہمشیرہ متوجہ ہوئیں۔ حضرت امام حسینؑ سے پوچھا کہ یہ کیا شور ہے۔ امام حسینؑ نے اپنے بھائی عباس ابن علی سے کہا کہ جائیں اور ان سے پوچھیں کہ اس وقت ان کا ہماری طرف آنے کا کیا مقصد ہے۔ جب وہ گئے تو انھیں جواب دیا گیا کہ امیر کا حکم آیا ہے کہ ہم اسی وقت آپ کے خلاف جنگ کریں گے یا پھر آپ بیعت کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ حضرت عباس نے واپس آ کر ان کا پیغام پہنچایا تو امام حسینؑ نے فرمایا: ان لوگوں سے کہو کہ آج کی رات ٹھہر جائیں اور کل صبح جنگ کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے اس طلب مہلت کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا: میں چاہتا ہوں کہ آج کی رات عبادت و استغفار میں بسر کر لوں۔ آپ نے فرمایا: انی احب الصلوۃ لہ۔ (مجھے نماز بجالانا بہت محبوب ہے)۔[۱]

عاشورا کی نماز ظہر

روز عاشورا نماز ظہر کا وقت پہنچا تو امام حسینؑ کے صحابی حضرت عمرو بن کعب جو ابو ثمامہ صائدی کے نام سے مشہور ہیں، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے:

میری جان آپ پر فدا اگر چہ ان لوگوں نے آپ پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے لیکن اللہ کی قسم جب تک یہ لوگ مجھے قتل نہ کر دیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ میں اس حالت میں اپنے پروردگار سے ملاقات کروں کہ ایک اور نماز آپ کی امامت میں ادا کر چکا ہوں۔

امام حسینؑ نے اُن کے جواب میں ارشاد فرمایا:

ذکرت الصلوۃ جعلک اللہ من المصلین الذاکرین، نعم ھذا اول وقتھا۔

تو نے نماز کو یاد دلایا اللہ تجھے نمازیوں اور ذکر کرنے والوں میں سے قرار دے، ہاں یہ نماز کا وقت اول ہے۔

آپ نے مزید فرمایا: دشمن سے کہیں کہ وقتی طور پر جنگ سے ہاتھ روک لیں تا کہ ہم نماز ادا کر سکیں۔ اس پر فوج یزید کا ایک سردار حصین کہنے لگا انھا لا تقبل (تمھاری نماز ہی قبول نہیں)۔

امام حسینؑ کے صحابی حبیب ابن مظاہر نے اس کا جواب دیا۔ اس پر پھر شدید جنگ چھڑ گئی جس میں حبیب ابن مظاہر شہید ہو گئے۔ اس کے بعد حالت یہ تھی کہ تیر دشمنوں کی طرف سے امام حسینؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کی طرف یوں آ رہے تھے جیسے بارش

۱۔ ابو مخنف، مقتل الحسین، ص ۱۰۶

شیخ مفید، الارشاد، ج ۲، ص ۹۱

برس رہی ہو۔آپ نے اسی حالت میں نماز ادا کی اوراس دوران میں آپ کے دوساتھی خاک وخون میں غلطاں ہو گئے۔نماز کے بعدابوثمامہ نے اپنے وعدے کے مطابق امام حسینؑ سے جنگ کی اجازت طلب کرتے ہوئے کہا:

یا ابا عبداللہ! جعلت فداک قد هممت ان الحق باصحابک و کرهت ان اتخلف فاراک وحیدا فی اهلک قتیلا

اے اباعبداللہ! میں آپ پر قربان، میں ارادہ کر چکا ہوں کہ میں آپ کے ساتھیوں کے ساتھ جاملوں اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں پیچھے رہ جاؤں اور آپ کو آپ کے اہل کے ساتھ اکیلا قتل ہوتے ہوئے دیکھوں۔

امام علیہ السلام نے ان کے جواب میں فرمایا:

تقدم فانا لاحقون بک عن ساعة

قدم بڑھاؤ ہم بھی گھڑی بھر میں تم سے آملیں گے۔

اس کے بعد انھوں نے دشمن کی صفوں پر حملہ کیا، خوب جنگ کی اور راہِ حق میں شہید ہو گئے۔[1]

اسی نماز ظہر کے دوران میں سعید بن عبداللہ حنفی جو جماعت سے آگے کھڑے ہوئے تھے تاکہ برستے تیروں کو اپنے سینے پر لیں اور امام حسینؑ اور دیگر نمازیوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں، جدھر سے بھی تیر آتا وہ آگے ہو جاتے یہاں تک کہ آپ کا بدن زخموں سے چور ہو گیا اور آپ زمین پر آ گرے اس حالت میں کہ کہہ رہے تھے:

اللهم العنهم لعن عاد و ثمود ابلغ نبیک منی السلام و ابلغه ما لقیت من الم الجراح فانی اردت بذلک ثوابک فی نصرة ذریة نبیک صلی اللہ علیه و آله و سلم۔

یااللہ! ان لوگوں پر وہ لعنت نازل فرما جو تو نے عاد وثمود پر کی یااللہ اپنے نبی تک میرا اسلام پہنچا اور جو زخم مجھے پہنچ رہے ہیں اس کی انھیں خبر دے۔ میں یہ زخم فقط اس لیے جھیل رہا ہوں کہ تیرے نبی کی ذریت کی نصرت کرتے ہوئے مجھے ثواب حاصل ہو۔

اُن کے گرتے گرتے نماز تمام ہو چکی تھی انھوں نے امام حسینؑ کی طرف رخ کر کے عرض کی:

أَوَفِيتُ يَاابْنَ رسول اللہ

اے رسول اللہ کے فرزند! کیا میں نے وفا کر دی؟

امام حسینؑ نے ان کے جواب میں فرمایا:

نعم انت امامی فی الجنه[2]

---

[1]۔ابن طاؤس، لھوف، ص ۹٦

[2]۔ابن طاؤس، الھوف، ص ٦٦

ہاں تم مجھ سے آگے آگے جنت میں پہنچ رہے ہو۔

دم رخصت جناب زینب سے التماس دعا

امام حسینؑ سے آپ کی ہمشیرہ جناب زینب کو جو پیار تھا وہ تو دنیا میں ایک مثال بن چکا ہے۔ امام حسینؑ کے مشن کی تکمیل میں جناب زینبؑ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انھوں نے اپنے ننھے بچوں عون ومحمد کو کربلا میں اسی راہ حق میں قربانی کے لیے پیش کر دیا اور خود بھی جو مصیبتیں اٹھائیں ان کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ آپ کا لقب ''ام المصائب'' ہو گیا۔ یہی زینبؑ عشق الٰہی اور خدا پرستی میں اپنی مثال آپ تھیں اور اتنی گراں مصیبتیں اس عشق کے بغیر اتنی وجاہت وعزیمت سے اٹھائی بھی نہیں جاسکتی تھیں۔ اُن کی عبادت الٰہی کا یہ عالم تھا کہ امام حسینؑ نے خیام حسینی میں الوداع کہتے ہوئے اُن سے خواہش کی کہ:

بہن! اپنی نماز شب کی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا۔

کیا مقام ہے جناب زینبؑ کا، آپ کی نمازوں کا اور آپ کی مقبولیت دعا کا کہ سید الشہداؑ اتنی عظیم قربانیاں پیش کرنے کے بعد بھی اپنے آپ کو جناب زینبؑ کی خصوصی دعاؤں کا نیاز مند سمجھتے ہیں۔ اس سے اللہ کے حضور امام حسینؑ کی انکساری اور جذبہ عبودیت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

روز عاشورا کے آخری لحظوں کی دعا

جب امام حسین کا بدن خون میں غرق تھا، زخموں سے چور چور آپ خاک کربلا پر پڑے تھے اس وقت اپنے اللہ کو یوں پکار رہے تھے:

اللهم متعالی المکان، عظیم الجبروت شدید المحال غنی عن الخلائق، عریض الکبریاء قادر علی مایشاء قریب الرحمة صادق الوعد سابق النعمة حسن البلاء قریب اذا دعیت محیط بما خلقت قابل التوبة لمن تاب الیک قادر علی ما اردت و مدرک ما طلبت و شکور اذا سکرت و ذکور اذا ذکرت۔ ادعوک محتاجا و ارغب الیک فقیرا و افزع الیک خائفا و ابکی الیک مکروبا و استعین بک ضعیفا و اتوکل علیک کافیا احکم بیننا و بین قومنا بالحق فانهم غرونا و خدعونا و غدرونا و قتلونا و نحن عترہ نبیک و ولد حبیبک محمد بن عبداللہ الذی اصطفیته بالرسالة و ائتمنته علی وحیک فاجعل لنا من امرنا فرجا و مخرجا بر حمتک یا ارحم الراحمین۔[1]

یا اللہ! تیرا مقام بلند ہے، تیری قدرت عظیم ہے، تیرا غضب شدید ہے تو اپنی مخلوقات سے بے نیاز ہے، تیری کبریائی وسیع ہے، تو جو چاہے اس پر قادر ہے، تیری رحمت قریب ہے، تو اپنے وعدوں میں سچا ہے، تیری

۱۔ محمد بن مشھدی، المز ار، ص ۳۹۹

نعمت سبقت رکھتی ہے، تیری آزمائش خوبصورت و حسین ہے، جب تجھے پکارا جائے تو تو قریب ہے، جو کچھ تو نے پیدا کیا ہے اُس پر تو محیط ہے، جو تیری طرف لوٹ آئے تو اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے، تو جس امر کا ارادہ کرے اس پر قدرت رکھتا ہے، تو جو چاہے پا لیتا ہے، جب تیرا شکر ادا کیا جائے تو شکر قبول کرنے والا ہے، جب تیرا ذکر کیا جائے تو تو توجہ فرماتا ہے۔ میں ایک محتاج ہو کر تجھے پکار رہا ہوں، میں ایک فقیر ہو کر تیری طرف رغبت کیے ہوئے ہوں، میں خوف کے عالم میں تجھ سے فریاد کر رہا ہوں، عالم مصیبت میں تیرے حضور گریہ کناں ہوں۔ ایک کمزور انسان ہوں اور تجھ سے مدد کا طالب ہوں۔ تجھ پر بھروسہ کیے ہوئے ہوں اور تو ہی بھروسے کے لیے کافی ہے۔ ہمارے اور ہماری قوم کے مابین تو برحق فیصلہ فرما۔ یہ لوگ ہم پر چڑھ دوڑے، انھوں نے ہم سے دھوکا کیا۔ انھوں نے ہم سے غداری کی اور ہمارا قتل [عام] کیا۔ ہم تیرے نبی کی عترت ہیں ہم تیرے اس حبیب محمد بن عبداللہ کی اولاد ہیں جنھیں تو نے اپنی رسالت کے لیے چنا اور جنھیں تو نے اپنی وحی کا امین قرار دیا پس ہمارے امر میں فراخی عطا فرما اپنی رحمت کے صدقے اے سب سے بڑھ کر رحم کرنے والے۔

آخری لمحات

امام حسینؑ نے اپنی قتل گاہ میں طرح طرح سے اپنے پروردگار کو یاد کیا اور اُس کی رضا پر راضی رہنے کا اعلان کیا۔ جب آپ اپنے گھوڑے سے زمین پر گرے تو آپ کا دایاں رخسار پہلے زمین پر آیا اس وقت آپ نے یہ کلمات ادا کیے:

یاالٰھی! صبرا علی قضائک لا معبود سواک یا غیاث المستغیثین[1]

آپ کے آخری الفاظ یہ تھے:

بسم اللّٰہ و باللّٰہ و علی ملة رسول اللّٰہ[2]

یا اللہ یہ قلیل قربانی قبول فرما

جب امام حسینؑ کی شہادت کے بعد جناب زینبؑ امام حسینؑ کی لاش کے پاس پہنچیں تو اللہ تعالیٰ کے حضور فریاد کرنے لگیں جس میں انھوں نے امام حسینؑ کی مظلومیت کو بیان کیا اس کے آخر میں بارگاہ الٰہی میں یوں عرض گزار ہوئیں:

۱۔ جواد القیومی، صحیفة الحسین، ص ۱۰۰، ح ۴۰

۲۔ سید ابن طاؤس، لھوف، ص ۷۱

جواد القیومی، صحیفة الحسین، ص ۱۰۰، ح ۴۰

ربناتقبل مناھٰذاالقلیل القربان

اے ہمارے رب ہماری یہ قلیل سی قربانی قبول فرما۔

واقعاً اللہ کی عظمت و کبریائی کا احساس کس طرح سے نبی کریمؐ کے خاندان کے فرد فرد میں موجزن تھا۔امام حسینؑ کے مقام کی عظمت اور اُن کی شہادت کے مقامِ بلند سے کس کو انکار ہوسکتا ہے لیکن عظمت الٰہی کے مقابلے میں تو امام حسینؑ کی اپنی یہ حالت ہوتی تھی کہ وضو کرتے ہوئے رنگ پیلا پڑ جاتا اور بدن کانپنے لگتا۔ بی بی زینب سے بڑھ کر امام حسینؑ اور اُن کی قربانی کی اہمیت اور مقام کون جان سکتا ہے۔ وہی بی بی اپنے اللہ کے حضور یہ کلمات ادا کریں تو اسے اُن کے جذبہ عبودیت اور احساس مقام کبریائی کے اظہار کے سوا اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے گہرے شعور کے ساتھ یہ ساری قربانیاں خالص اپنے اللہ کی خوشنودی اور رضا کے حصول کے لیے پیش کی تھیں۔

بعض روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے یہ کلمات اس وقت ادا کیے جب آپ امام حسینؑ کی لاش پر پہنچیں آپؑ نے لاش کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر اُسے اٹھایا اور پھر آسمان کی طرف رخ کر کے یہ کلمات ادا کیے۔[1]

کربلاعشاق کی مقتل گاہ

ایک روایت میں کربلا کو عاشقوں کی مقتل گاہ قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ہے کہ جب امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب صفین کی طرف جارہے تھے، یعنی جب جنگ صفین میں کوفہ سے شام جارہے تھے تو راستے میں ''سرزمین نینوا'' (کربلا) پر پہنچے۔ آپ نے وہاں سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی، اسے سونگھا اور پھر فرمایا:

اِیۡہِ لَکِ اَیَّتُھَا التُّرۡبَۃُ لَیُحۡشَرَنَّ مِنۡکِ اَقۡوَامٌ یَدۡخُلُوۡنَ الۡجَنَّۃَ بِغَیۡرِ حِسَابٍ۔

یعنی اے خاک کربلا! تو بڑی خوش قسمت ہے کیونکہ تجھ سے ایسے افراد محشور ہوں گے جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے:

اس کے بعد آپ نے فرمایا:

مُنَاخُ رُکَّابٍ وَمَصَارِعُ عُشَّاقٍ

یہ سواروں کے پڑاؤ کی جگہ ہے اور عاشقوں کی مقتل گاہ ہے۔[2]

---

[1]۔حائری محمد مہدی: شجرہ طوبی، ج ۲، ص ۳۹۳، قریشی، باقر: حیات امام حسین ج ۲، ص ۳۰۱

[2]۔نفس المھموم، ص ۲۰۶

دربارابن زیاد میں جمال الٰہی کے تذکرے

اہل بیت نے دربار یزید وابن زیاد میں بھی اللہ کے جمال وجلال کے تذکرے جاری رکھے۔کوفہ میں جب یہ لٹا پٹا قافلہ دربار ابن زیاد میں پہنچا تو نیزوں پر شہدا کے سر تھے۔امام زین العابدینؑ اور دیگر قیدی رسن بستہ تھے۔اُن کی کسمپرسی اور مظلومیت کو دیکھ کر ابن زیاد احساس تفاخر میں مبتلا تھا۔وہ اپنی کامیابی کے تذکرے کررہا تھا۔اُس نے غرور کے عالم میں جناب زینب سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

الحمدللہ الذی فضحکم و قتلکم و اکذب احدو ثتکم

حمد ہے اُس اللہ کی جس نے تمھیں رسوا کیا تمھیں مارااور تمھاری باتوں کو جھٹلایا۔

اس کے جواب میں جناب زینبؑ یوں گویا ہوئیں:

الحمدالذی اکرمنا بمحمد (ص) و طہرنا تطہیرً اانما یفتضح الفاسق و یکذب الفاجر و ھو غیرنا۔

حمد ہے اس اللہ کی جس نے محمدؐ کو ہم میں بھیج کر ہمیں عزت بخشی اور ہمیں پاک و پاکیزہ بنایا اس میں شک نہیں کہ اس نے فاسق کو رسوا کیا اور فاجر کو جھٹلایا اور وہ ہم نہیں بلکہ ہمارا غیر ہے۔

اس پر ابن زیاد کہنے لگا:

کیف رائت صنع اللہ باھل بیتک

اللہ نے تمھارے اہل بیت کے ساتھ جو کچھ کیا تم نے اسے کیسا پایا۔

اس پر جناب زینبؑ نے بڑا تاریخ ساز اور ایمان افروز جملہ ادا فرمایا:

ما رائت الا جمیلا

ہم نے تو ہر حال میں اللہ کو جمیل ہی پایا ہے۔[1]

ان شہادتوں،مسافتوں،قید اور دشمن کی طرف سے اہانتوں کو انھوں نے تو خالص اپنے اللہ کو پانے اور اُس کی قربت کے لیے برداشت کیا تھا۔وہ تو ہر قدم پر اللہ کی مزید قربتوں کے احساس سے سرشار ہورہے تھے۔انھیں تو ہر طرف اللہ ہی کے جلوہ ہائے جمال دکھائی دے رہے تھے۔ان کا سب کچھ اللہ کے لیے تھا اور ان کے لیے سب کچھ اللہ ہی تھا۔

ناصرالدین شاہ قاچار کا سلام عقیدت

ناصرالدین شاہ قاچار نے بارگاہ الٰہی میں امام حسینؑ کی عاشقانہ شہادت کے آخری مرحلے کو بہت خوبصورتی سے نظم کیا ہے:

این من و این ذکر یارب یاربم

این من واین ناله های زینبم

---

[1] ابن نما،مثیر الاحزان،ص ۷۱

پس خطاب آمد زحق کای شاه عشق
ای حسین ای یکّه تاز راه عشق
گر تو برما عاشقی ای محترم
پرده برچین من زتوعاشق ترم
هرچه از دست داده ای در راه ما
مرحبا صد مرحبا خود هم بیا
خود بیاکه می کشم من ناز تو
عرش و فرشم جمله پا انداز تو
خود بیا که من خریدار توام
مشتری برجنس بازار توام
لیک خود تنها میا در بزم یار
خود بیا واصغرت را هم بیار
خوش بود در بزم یاران بلبلی
خاصه در منقار او باشدگلی
خود تو بلبل،گل عليِّ أصغرت
زودتر بشتاب سوی داورت

یہ میں ہوں اور یہ میرا ذکر ہے یا رب یا رب، یہ میں ہوں اور یہ میری (بہن) زینب ہے۔
اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے شاہ عشق! اے حسین!، اے راہ عشق کے تنہا مسافر،
اے محترم! اگر تو ہم پر عاشق ہے تو پردہ اٹھا کر دیکھ کہ میں زیادہ عاشق ہوں۔
تو نے جو بھی ہمارے راستے میں دیا ہے اس پر مرحبا، صد مرحبا، اب تو خود بھی آ جا۔
تو خود آ کہ میں تیرے ناز اٹھاؤں، عرش و فرش ہر چیز تیرے قدموں پر نثار۔
تو خود آ کہ میں تیرا خریدار ہوں، تیرے بازار کی جنس کا میں ہی خریدار ہوں۔
لیکن تو بزم یار میں تنہا نہ آ، خود بھی آ، اور اپنے اصغر کو بھی لے آ۔
بزم دوستاں میں بلبل خوش رہے گی، خاص طور پر جب اس کی چونچ میں پھول بھی ہوگا۔
تو تو بلبل ہے اور تیرا علی اصغر پھول ہے اب جلد داور (حاکم مطلق) کی طرف آ جا۔

□□□□□

کربلا کی خواتین

حجۃ الاسلام مولانا سید فدا حسین بخاری

کربلا میں جہاں مردوں نے حضرت امام حسین علیہ سلام اوران کے ساتھیوں نے بے مثال قربانیاں پیش کیں وہاں خاندان عصمت وطہارت کی خواتین اور اہل بیت علیہ السلام سے محبت رکھنے والی خواتین نے بھی جذبہ ایثار وقربانی کی وہ لازوال داستان رقم کی کہ جس کی مثال کائنات میں نہیں ملتی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ[1]

جو نیک عمل کرے خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو ہم اسے پاکیزہ زندگی ضرور عطا کریں گے اور ان کے بہترین اعمال کی جزا میں ہم انھیں اجر (بھی) ضرور دیں گے۔

اگر کربلا کے جہاد میں خواتین شامل نہ ہوتیں تو اس کی وہ عظمت نہ ہوتی جو اب اسے حاصل ہے۔ حضرت امام حسین علی سلام وقت کے امام تھے اور قافلۂ شہداء کے میر کارواں تھے تو سیدہ زینب سلام اللہ علیہا اسراء کی قافلہ سالار تھیں اور شہداء کا پیغام پہنچانے کے لیے جو کردار کربلا کی خواتین خصوصاً جناب سیدہ زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا نے انجام دیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

شاعر مشرق علامہ اقبال فرماتے ہیں:

حدیث عشق دو باب است کربلا و دمشق
یکی حسین رقم کرد و دیگری زینب

ہم زیر نظر مقالہ میں ان خواتین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جو کربلا میں موجود تھیں جنھوں نے شہداء کے پیغام کو پہنچایا اور اذیتیں

---

[1] النحل: ۹۷

مئی تا جولائی 2026
محرم الحرام نمبر

اور مصیبتیں جھیلیں اور اسلام وقرآن کی بقاء کے لیے اسیری کی صعوبتیں برداشت کیں اور نظریہ توحید ونبوت وامامت کے تحفظ کے لیے اپنے بچوں، بھائیوں اور شوہروں کی قربانیاں دیں۔

کربلا کی خواتین میں جس خاتون کا کردار سب سے نمایاں ہے، اس خاتون کے ذکر سے شروع کرتے ہیں:

ا۔حضرت زینب بنت علی ابن ابی طالب علیہ السلام:

آپ کا نام "زینب" اللہ تعالیٰ کے حکم سے رسول کریم صلی نے رکھا۔ آپ کے بہت سے القابات ہیں جن میں سے کچھ کا تذکرہ کرتے ہیں:

ثانی زهراء۔ صدیقه صغری۔ عقیله بنی هاشم۔ عالمه غیر معلمه۔ فهیمه غیر مفهمه۔ شریکة الحسین۔ الکامله۔ الفاضله المعصومة الصغری۔

جناب زینب کبری سلام اللہ علیہا سنہ ۶ ہجری کو مدینہ منورہ میں متولد ہوئیں۔ آپ کی مادر گرامی جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا، والد حضرت امیر المومنین علیؑ، نانا رسولؐ خدا، نانی جناب خدیجہ سلام اللہ علیہا، دادا حضرت ابوطالب علیؑ اور دادی جناب فاطمہ بنت اسد سلام علیہ تھیں۔ جس وقت آپ کی ولادت ہوئی تو جناب زہراء سلام اللہ علیہا نے حضرت امام علیؑ کو آپ کا نام معین کرنے کے لیے کہا تو حضرت علیؑ نے فرمایا کہ میں اس امر میں رسولؐ اللہ حاصل نہیں کرسکتا، لہذا جب دونوں حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نومولود کی نام گذاری کی تجویز رکھی تو حضور نے فرمایا کہ میں اپنے رب کے فرمان کا منتظر ہوں۔

اسی وقت جناب جبرئیل امین درود وسلام کے ساتھ نازل ہوئے اور فرمایا کہ یا رسولؐ اللہ! اس نومولود کا نام اللہ تعالیٰ نے زینب معین فرمایا ہے۔ اس طرح آپ کا نام زینب معین ہوا۔ یعنی وہ بیٹی کہ جو اپنے باپ کی زینت ہے۔ نام گذاری کے بعد رسول اسلامؐ نے حضرت زینب سلام اللہ علیہا کو اپنے ہاتھوں پر اٹھایا اور گریہ کرنے لگے۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے جب گریہ کا سبب پوچھا تو حضور نے ان مصائب کو بیان فرمایا کہ جو آئندہ اس نومولود پر وارد ہونے والے تھے۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے پوچھا کہ بابا جو میرے اس مولود کی مصیبت پر گریہ کرے گا اس کا ثواب کیا ہوگا؟ تو حضور نے فرمایا: جو زینب پر روئے، اسے حسن و حسین پر رونے کا ثواب نصیب ہوگا۔

جناب زینب کبری کو رسول گرامی قدر، حضرت زہراء، امام علی، امام حسن، امام حسین، امام سجاد اور امام باقر علیہم السلام کی مصاحبت کا شرف حاصل ہوا۔ آپ علم وتقوی وزہد کے بلند مرتبہ پر فائز تھیں۔ حضرت امام سجاد علی السلام نے آپ کے بارے میں فرمایا:

اَنْتِ بِحَمْدِ اللهِ عَالِمَةٌ غَيْرُ مُعَلَّمَةٍ، فَهِمَةٌ غَيْرُ مُفَهَّمَةٍ۔[1]

ا۔بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۹۹

الحمدللہ آپ ایسی عالمہ ہیں کہ جن کا کوئی معلم نہیں اور ایسی فہمیدہ ہیں کہ کسی کو انھیں سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

آپ نے مذکورہ معصومین علیہ السلام سے روایات نقل کی ہیں اور آپ سے بیشمار اصحاب پیغمبر نے بھی روایت کی ہے جن میں عبداللہ ابن عباس، عبداللہ بن جعفر محمد بن عمرو الہاشمی، عطاء بن سائب جیسے اصحاب شامل ہیں۔

مؤرخ شیخ عبداللہ مامقانی لکھتے ہیں کہ چونکہ امام سجادؑ کربلا میں بیمار تھے، لہٰذا امام حسین علیہ سلام نے امامت کی بعض امانتیں جناب زینب سلام اللہ علیہا کے سپرد کیں اور چند وصیتیں بھی آپ کو فرمائیں۔ یہاں تک کہ امام حسینؑ اور امام سجادؑ دونوں نے آثار ولایت اور احکام الٰہیہ کو بیان کرنے میں آپ کو اپنی نائب خاصہ بنایا تھا۔ اسی لیے لوگ حضرت امام سجادؑ کی شفا یابی تک حلال وحرام الٰہی کے جاننے کے لیے جناب زینب کبری سلام اللہ علیہا کی طرف رجوع کرتے تھے۔

آپ کے فہم و علم کا یہ عالم تھا کہ امام علیؑ نے کمسنی میں آپ سے فرمایا کہ اے میری نور نظر! (واحد) کہو تو جناب زینب نے اپنی زبان سے واحد کہا، پھر امام نے فرمایا بیٹا اثنین (دو) کہو تو آپ نے فرمایا: میں اپنی زبان کہ جس سے ابھی ابھی میں نے واحد کہا اثنین (دو) کیسے کہہ سکتی ہوں؟ اس سے آپ کا اشارہ خدا کے ایک ہونے (توحید) کی طرف تھا۔

جب حضرت امیر سنہ ۳۶ھ میں کوفہ تشریف لے گئے تو لوگوں کی درخواست پر جناب زینب سلام اللہ علیہا نے عورتوں کو تفسیر قرآن اور دوسرے علوم دینیہ سے بہرہ مند فرمایا۔ ایک مرتبہ آپ عورتوں سے کہیعص کی تفسیر فرما رہی تھیں کہ حضرت امام علیؑ گھر میں داخل ہوئے اور آپ نے بیٹی کی آواز سنی تو فرمایا: اے زینب! یہ حروف کربلا میں آپ کے بھائی حسینؑ پر نازل ہونے والی مصیبت کو بیان کرتے ہیں۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا کی شادی جناب عبداللہ بن جعفر طیار سے ہوئی۔ اگر چہ کئی خواستگاروں نے خواستگاری کی لیکن امام علیؑ نے سب کو رد فرمایا۔ جب آپ اپنے شوہر کے گھر تشریف لائیں تو جناب عبداللہ کے مال میں برکت ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے عبداللہ کو مال کثیر عطا فرمایا لیکن شوہر کے یہاں سب کچھ ہونے کے باوجود بی بی کے زہد کا یہ عالم تھا کہ امام زین العابدینؑ فرماتے ہیں:

إِنَّهَا مَا ادَّخَرَتْ شَيْئًا مِنْ يَوْمِهَا لِغَدِهَا أَبَدًا۔[1]

میری پھوپھی جناب زینب نے کبھی بھی کل کے لیے کوئی شے بچا کر نہیں رکھی۔

حضرت امام سجادؑ کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ جناب زینب سلام اللہ علیہا جو کچھ گھر میں ہوتا یا تو اسے مصرف میں لے آتیں یا پھر راہ خدا میں خرچ کر دیتیں۔

آپ کی عفت و پاکدامنی کا عالم یہ تھا کہ اگر چہ اب عصمت کبری کے درجہ پر فائز نہیں تھیں لیکن آپ کو عصمت صغری ضرور حاصل تھی۔ ابھی آپ کا بچپن تھا لیکن یحیی مازنی کہتا ہے کہ میرا گھر حضرت علیؑ کے پڑوس میں تھا لیکن نہ میں نے کبھی زینب کبری سلم

۱۔ وفیات الائمہ، ص ۴۴۱

علیہا کو دیکھا اور نہ ہی کبھی ان کی آواز سنی۔ جب بھی آپ اپنے نانا رسول اللہ صلی السلام کی زیارت کو جاتیں تو رات میں گھر سے اس حالت میں نکلتیں کہ امام حسنؑ آپ کے دائیں اور امام حسینؑ آپ کے بائیں جانب اور حضرت علیؑ آپ کے آگے ہوتے تھے اور جب روضہ رسول پر پہنچتیں تو حضرت علیؑ قندیلوں کو بجھا دیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب امام حسنؑ نے چراغ بجھانے کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ لوگ آپ کی بہن کو دیکھ سکیں۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ آپ نے کبھی نوافل کو ترک نہیں فرمایا۔ اسی لیے حضرت امام حسین عال السلام نے وقت وداع فرمایا تھا:

يَا اُخْتَاهُ لَا تَنْسِنِي فِي نَافِلَةِ اللَّيْلِ

اے میری بہن زینب! مجھے نماز شب میں فراموش نہ کرنا۔

جناب فاطمہ بنت حسین علیہ السلام فرماتی ہیں کہ جناب زینب سلام اللہ علیہا نے شب عاشور بھی نماز شب کو ترک نہیں فرمایا۔ امام سجادؑ نے فرمایا کہ میری پھوپھی نے کربلا سے شام کے سفر کی مشقتوں میں کسی بھی وقت نماز شب کو ترک نہیں فرمایا۔ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ آپ نماز بیٹھ کر ادا کر رہی ہیں تو پوچھا: اے پھوپھی! آپ کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا کیا سبب ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ دشمن ہم سب کو چوبیس گھنٹے میں صرف ایک ایک روٹی دیتے ہیں، لہذا بچوں کی بیتابی کو دیکھ کر میں اپنا حصہ انھیں دے دیتی ہوں جس کی وجہ سے میرے بدن پر اس قدر ضعف طاری ہے کہ میں بیٹھ کر نوافل ادا کرتی ہوں۔[1]

جناب زینب سلام اللہ علیہا نے اپنے دونوں فرزندوں کے ساتھ کربلا میں شرکت کی اور امام حسین علی سلام کی شہادت کے بعد آپ کے قیام وشہادت کے مقاصد کو مسلمانوں کے گھر گھر منتقل فرمایا۔ آپ نے مصیبتوں پر ایسا صبر فرمایا کہ تاریخ میں کوئی بی بی نظر نہیں آتی کہ جن پر ایک دن میں اس قدر مصائب پڑے ہوں اور اس کے باوجود وہ صبر کی اس منزل پر فائز ہوئیں ہو کہ جب ابن زیاد نے پوچھا کہ تمھارا اس اللہ کے بارے میں کیا خیال ہے جس نے تمھارے بھائی حسینؑ کے ساتھ ایسا سلوک کیا؟

تو آپ نے فرمایا:

مَا رَأَيْتُ إِلَّا جَمِيلًا هَؤُلَاءِ قَوْمٌ كَتَبَ اللهُ عَلَيْهِمُ الْقَتْلَ فَبَرَزُوا إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَ سَيَجْمَعُ اللهُ بَيْنَكَ وَبَيْنَهُمْ فَتُحَاجُ وَتُخَاصَمُ فَانْظُرْ لِمَنِ الْفَلْجُ يَوْمَئِذٍ ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ يَا ابْنَ مَرْجَانَةَ

میں نے حکم پروردگار میں خوبی وزیبائی کے علاوہ کوئی شے نہیں دیکھی، ہم وہ قوم ہیں جن کے لیے خدا نے درجہ شہادت کو قلم قدرت سے لکھ دیا ہے انھوں نے طریق الٰہی کو سامنے رکھا اور وہ اپنی مقتل کی طرف گئے اور اللہ تعالیٰ عنقریب تجھے اور انھیں جمع فرمائے گا اور اس وقت اس عادل حقیقی کی بارگاہ میں مقدمہ پیش ہوگا۔ اس وقت تمھیں اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ کون کامیاب

۱۔ عوالم العلوم، ج ۱۱، ص ۹۵۴

ہوگا؟ اومر جانہ کے جائے! تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔[1]

جناب زینب کبری سلام اللہ علیہا صابرہ ہونے کے ساتھ ساتھ شجاع بھی تھیں جس کا اندازہ آپ کے کوفہ وشام میں دیئے گئے خطبات سے لگایا جاسکتا ہے۔ انہی خطبوں کے نتیجہ میں ابن زیاد و یزید جیسے طاغوت زمانہ آپ کے سامنے زبان درازی نہ کرسکے۔ یہاں تک کہ جب آپ شام سے مدینہ واپس لوٹیں تو آپ نے اہل مدینہ کے سامنے کربلا میں چشم دیدہ مصائب کی تصویر کشی کی جس کہ وجہ سے، مدینہ والوں میں ایک انقلاب برپا ہوگیا۔ والی مدینہ نے جب اس بات کی خبر یزید تک پہنچائی تو یزید نے حکم دیا کہ جناب زینب کبری سلام اللہ علیہا کو کسی صورت مدینہ چھوڑنے پر مجبور کیا جائے۔

جناب زینب سلام اللہ علیہا بنی ہاشم کی چند عورتوں کے ساتھ مدینہ سے آخری مرتبہ رخصت ہوئیں اور ۲۷ رجب یا شعبان سنہ ۶۱ ھ کے اوائل میں شہر مصر میں داخل ہوئیں۔ بعض مؤرخین کہتے ہیں جناب زینب سلام اللہ علیہا کی شہادت اسی شہر میں واقع ہوئی اور شام میں آپ کی بہن جناب ام کلثوم سلام اللہ علیہا (زینب صغری بنت علی و فاطمۃ) دفن ہیں، جبکہ دیگر علماء کا قول یہ ہے کہ مصر کے بعد آپ شام تشریف لائیں جہاں آپ کی شہادت واقع ہوئی اور موجودہ مقبرہ جناب زینب کبری سلام اللہ علیہا سے منسوب ہے۔

۲۔ حضرت ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب علیہ سلام:

آپ کا نام زینب صغری اور آپ کی کنیت ام کلثوم تھی۔ آپ کی ولادت ۱۶ شعبان سنہ ۹ ھ ق میں واقع ہوئی۔ آپ کا عقد حضرت امیر المومنینؑ نے اپنے بھتیجے جناب عون بن جعفر طیار سے فرمایا تھا۔ جناب ام کلثوم کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ دونوں زوجہ و شوہر کربلا میں حاضر ہوئے جہاں دین اسلام کی بقاء کے لیے جناب عون نے جام شہادت نوش فرمایا۔

بعد از واقعہ عاشورہ جناب سیدہ ام کلثوم اسیر ہوئیں اور جناب زینب کبری سلام علیہا کی طرح کوفہ اور شام میں آپ نے فصیح و بلیغ خطبے ارشاد فرمائے۔ مدینہ واپسی کے بعد ۶۱ ھ ہی میں آپ نے دار فانی کو وداع کیا۔

آپ نے اہل کوفہ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا:

اے اہل کوفہ! تمھارے چہرے سیاہ ہو جائیں۔ تم نے امام حسینؑ کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ دیا اور ان کو قتل کر دیا اور اسی بات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے مال و اسباب کو لوٹا اور ان کے اہل حرم کو اسیر کر لیا اور اذیتیں دیں۔ تم تباہ ہو جاؤ! جانتے ہو تم نے کتنا بڑا جرم کیا ہے اور اس کا وبال تمھاری گردنوں پر ہے۔

حضرت بی بی ام کلثوم سلام الہ علیہا اسیری سے رہائی کے بعد مدینہ پہنچنے پر جب نگاہ روضہ رسول کریم پر پڑی تو فرمایا:

مَدِینَۃَ جَدِنَا لَا تَقْبَلِینَا
خَرَجْنَا مِنْكِ بِالْأَهْلِینَ جَمْعًا

۱۔ بحار الانوار، ج ۴۵، ص ۱۱۶

فَبِالْحَسَرَاتِ وَ الْأَحْزَانِ جِئْنَا

رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَ لَا بَنِينَا

اے ہمارے جدامجد کے مدینہ! تو ہمیں قبول نہ کر کہ ہم بڑی حسرت اور حزن لے کر واپس آئے ہیں۔ جب ہم گئے تو ہمارا پورا کنبہ آباد تھا مگر جب لوٹے تو نہ ہمارے مرد ساتھ تھے اور نہ بچے۔

۳۔ حضرت رقیہ بنت علیؑ:

آپ حضرت امام علیؑ کی بیٹی تھیں۔ آپ کی شادی حضرت مسلم بن عقیل سے ہوئی۔ آپ کے دو بیٹے کوفہ میں شہید کیے گئے اور آپ کے شوہر امام حسینؑ کے سفیر تھے جو کوفہ میں شہید ہوئے۔ آپ کی بیٹی عاتکہ کی شہادت کربلا میں ہوئی۔ شام غریباں جب سادات کے خیموں پر حملے ہوئے تو آپ کی بیٹی عاتکہ گھوڑوں کے سموں تلے آ کے شہید ہوئیں۔ سیدہ رقیہ سلام اللہ علیہا نے اسیری کی صعوبتیں برداشت کیں اور حضرت امام سجادؑ کے ساتھ مدینہ واپس لوٹیں۔

۴۔ حضرت رباب بنت امرئ القیس بن عدی الکلبیہ:

آپ کا شمار زمانے کی بہترین اور افضل خواتین میں ہوتا ہے۔ آپ کے والد عیسائی تھے جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں شام سے مدینہ تشریف لائے اور اسلام قبول کیا۔ اسے قبیلہ قضاعہ کا امیر مقرر کیا گیا۔ انھوں نے مدینہ میں حضرت علیؑ سے ملاقات کی اس وقت امام حسنؑ اور امام حسینؑ بھی حضرت علیؑ کے ہمراہ تھے۔ حضرت علی علیہ سلام نے اپنا تعارف کروایا اور کہا کہ میں علی بن ابی طالب، رسول کریمؐ کا چچازاد بھائی اور ان کا داماد ہوں اور یہ میرے بیٹے ہیں جن کی ماں رسول اکرمؐ کی بیٹی سیدہ فاطمۃ الزہرا سلم اللہ علیہا ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ رشتہ داری کرنا چاہتے ہیں۔ امرئ القیس نے کہا: یا علیؑ! میری ایک بیٹی جس کا نام محیاۃ ہے اس کا عقد آپ سے کرنا چاہتا ہوں، دوسری بیٹی ہے جس کا نام سلمٰی ہے اس کی شادی آپ کے بیٹے امام حسنؑ سے کرنا چاہتا ہوں اور تیسری بیٹی جس کا نام رباب ہے اس کی شادی امام حسین سے کرنا چاہتا ہوں۔ صاحب کتاب اغانی کہتے ہیں: اسی دن رباب بن القیس کا نکاح حضرت امام حسینؑ سے ہوگیا۔ امرالقیس عرب کے بزرگ خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا بھائی زمانہ جاہلیت میں بحرین کا امیر بھی رہ چکا تھا۔ حضرت رباب حضرت امام حسین علی سلام کے نزدیک بڑی منزلت رکھتی تھیں۔ امام حسینؑ اپنی اس بیوی سے خاص محبت رکھتے تھے۔ آپ نے ان کے لیے اور اپنی پیاری بیٹی سکینہ کے لیے یہ اشعار کہے ہیں:

لَعَمْرَكَ إِنَّنِي لَأُحِبُّ دَارًا

تَكُونُ بِهَا سُكَيْنَةُ وَ الرَّبَابُ

أَحِبُّهما وَ أَبْذُلُ جُلَّ مَانِي
وَ لَيسَ لِعَاتِبِ عِنْدِي عِتَابُ

تیری جان کی قسم! میں اس گھر کو دوست رکھتا ہوں جس گھر میں سکینہ اور رباب ہوں۔ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں اور ان دونوں کے لیے اپنا پورا مال خرچ کر سکتا ہوں۔ اس میں کسی ملامت کرنے والے کے لیے ملامت کا کوئی حق نہیں ہے۔

حضرت رباب کا بیٹا عبداللہ (علی اصغر) کربلا میں شہید ہوا اور بیٹی سکینہ اور خود اسیر ہوئیں۔آپ نے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اسیری کی صعوبتیں برداشت کیں۔اسیری کے بعد مدینہ واپس آئیں اور ایک سال تک امام مظلوم کی شہادت پر گریہ و نالہ و زاری کی اور ۶۲ھ میں وفات پائی۔

۵۔سکینہ بنت الحسین بن علی بن ابی طالب علیہ سلام:

جناب سکینہ مدینہ منورہ میں متولد ہوئیں۔آپ کے والد بزرگوار حضرت امام حسینؑ اور والدہ ماجدہ جناب رباب بنت امرئ القیس تھیں۔آیت اللہ محمد صادق الکرباسی کے نزدیک شام میں شہید ہونے والی امام حسینؑ کی بیٹی کا نام رقیہ تھا جن کی قبر اسی نام سے دمشق میں موجود ہے۔اگر چہ بعض دیگر علماء کا نظریہ یہ بھی ہے کہ جناب سکینہ و جناب رقیہ ایک ہی فرد کے دو نام ہیں۔واللہ عالم۔

واضح رہے کہ جناب فاطمہ کبری، حضرت رقیہ اور جناب عبداللہ رضیع کے اسماء کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔اس کی وجہ سلاطین وقت اور مؤرخین کی اہل بیتؑ کے ساتھ عداوت و دشمنی تھی۔ایک وجہ ایک جیسے ناموں کا کثرت سے استعمال بھی تھی۔مثلاً فاطمہ کبری، فاطمہ وسطی اور فاطمہ صغری یا علی اکبر علی اوسط علی اصغر وغیرہ۔[۱]

۶۔ام اسحاق بنت اسحاق بنت طلحہؒ:

ان کی ولادت تقریباً ۳ھ اور وفات سنہ ۹۳ھ میں ہوئی۔آپ پہلے حضرت امام حسنؑ کے عقد میں تھیں ان کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق امام حسینؑ نے ان سے عقد کیا۔آپ کربلا میں موجود تھیں۔امام عالی سلام کی شہادت کے بعد آپ نے بھی اسیری کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔

۷۔فضہ نوبیہ:

جناب فضہ تقریباً سنہ ۲۵ قبل از ہجرت متولد ہوئیں۔جب آپ رسول گرامی قدرؐ کے پاس تشریف لائیں اور مسلمان ہوئیں

۱۔قارئین اس ضمن میں آیت اللہ صادق الکرباسی کی مفصل کتاب حسینی دائرۃ المعارف سے رجوع کر سکتے ہیں۔

تو حضور نے آپ کو آزاد فرمایا لیکن جناب فضہؑ نے آزادی کے باوجود رسول وآل رسول کی کنیزی میں اپنی زندگی وقف کر دی۔ حضرت زہرا سلام اللہ علیہا نے جناب فضہ کے ساتھ اس طرح دن تقسیم کیے کہ ایک روز خود بی بی خانہ داری فرماتیں اور دوسرے دن یہی ذمہ داریاں جناب فضہ کے سپرد ہوتیں۔ جناب فضہ کی عظمت کے لیے یہی کافی ہے کہ خود رسول اسلام صلی السلام نے آپ کا نام "فضہ" رکھا اور آپ کو مشکلات کے موقع پر اس دُعا کے پڑھنے کا حکم فرمایا:

يَا وَاحِدُ لَيسَ كَمِثْلِهِ أَحَدٌ، تُمِيتَ كُلَّ اَحَدٍ وَ تُفْنِي كُلَّ اَحَدٍ، أَنْتَ عَلَى عَرْشِكَ وَاحِدٌ، لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَ لَا نَوْمٌ[1]

اے واحد کہ تجھ جیسا کوئی واحد نہیں ہے، تیرے ہی ہاتھ میں ہر کسی کی موت اور فنا ہے۔ تو عرش پر بھی اکیلا ہے، تجھے نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی اونگھ۔

جناب فضہ نے رسول گرامی قدرؐ کے علاوہ واہلبیت علیہ السلام کے ہر فرد سے علمی استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ واقعہ اطعام مسکین ویتیم واسیر میں آپ نے حضرات حسنین شریفین کی شفایابی کے لیے روزے رکھے اور تین روز مسلسل اہل بیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے یتیم، مسکین اور اسیر کو اپنے حصہ کی روٹیاں عطا کیں۔

آپ نے اہل بیت اطہار علیہ السلام سے اس قدر کسب فیض فرمایا کہ چالیس سال تک صرف قرآن مجید کی آیات کے ذریعہ گفتگو کی۔ مشہور مؤرخ ابوالقاسم القشیری لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص مکہ جاتے ہوئے اپنے قافلے سے بچھڑ گیا کہ اثنائے راہ میں اس نے ایک خاتون (جناب فضہ) کو دیکھا جو اکیلی جارہی تھیں۔ اس شخص کا بیان ہے:

میں نے کہا: آپ کون ہیں؟ خاتون نے کہا:

وَقُلْ سَلَمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ[2]

"اور سلام کہو، عنقریب انھیں معلوم ہو جائے گا۔" میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے سلام کرنے کا کہہ رہی ہیں چنانچہ میں نے انھیں سلام کیا اور پوچھا: آپ اس صحرا میں کیا کر رہی ہیں؟ تو خاتون نے کہا:

وَمَنْ يَهْدِ اللهُ فَمَا لَهُ مِنْ مُضِلٍّ[3]

"جسے خدا ہدایت دے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے۔"

یعنی میں قافلہ سے بچھڑ گئی ہوں۔ میں نے کہا: آپ کہاں سے تشریف لا رہی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:

۱۔ عوالم العلوم، ج ۱۱، ص ۱۰۴۳

۲۔ زخرف: آیت ۸۹

۳۔ زمر: آیت ۳۷

أُولَئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَكَانٍ بَعِيدٍ[1]

"اور ان لوگوں کو بہت دور سے پکارا جائے گا۔"

یعنی میں بہت دور سے آ رہی ہوں۔ میں نے پوچھا: اور آگے کہاں کا قصد رکھتی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا:

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ[2]

"اور اللہ کے لیے لوگوں پر اس گھر کا حج کرنا واجب ہے۔"

یعنی میں حج کے لیے جا رہی ہوں۔ میں نے پوچھا: آپ قافلہ سے کب جدا ہوئیں؟ خاتون نے جواب دیا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ[3]

"اور ہم نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کی مخلوقات کو چھ دن میں پیدا کیا ہے۔"

یعنی میں سمجھ گیا کہ انھیں اپنے قافلے سے بچھڑے ہوئے چھ دن ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا: کیا آپ کھانا تناول فرمائیں گی؟

انھوں نے جواب دیا:

وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ[4]

"اور ہم نے ان لوگوں کے لیے ایسا جسم نہیں بنایا جو کھانا نہ کھاتا ہو۔"

یعنی میں کھانا کھانا چاہتی ہوں۔ چنانچہ میں نے انھیں کھانا کھلایا اور کہا میرے پیچھے تیز تیز چلیں۔ خاتون نے کہا:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا[5]

"اللہ کسی نفس کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

یعنی میں اپنی طاقت کے مطابق ہی تیز چل سکوں گی۔ میں نے کہا: کیا میں آپ کے ساتھ ایک سواری پر بیٹھ سکتا ہوں؟ انھوں نے جواب دیا:

۱۔ فصلت: ۴۴

۲۔ آل عمران: ۹۷

۳۔ ق: ۳۸

۴۔ سورہ انبیاء: ۸

۵۔ بقرہ: ۲۸۶

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللهُ لَفَسَدَتَا[1]

"اگر زمین و آسمان میں اللہ کے علاوہ اور خدا بھی ہوتے تو زمین و آسمان دونوں برباد ہو جاتے۔"

یعنی نامحرم کے ساتھ ایک سواری پر بیٹھنا موجب فساد ہو سکتا ہے۔ یہ سن کر میں سواری سے اتر آیا اور انھیں سوار کیا۔

ہم دونوں نے سفر شروع کیا یہاں تک کہ قافلے سے جا ملے۔ یہاں پہنچ کر میں نے پوچھا: کیا قافلہ میں آپ کا کوئی ساتھی ہے؟ انھوں نے جواب میں چار آیات کی تلاوت کی:

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ[2]

"اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں اپنا جانشین بنایا ہے"۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ[3]

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صرف ایک رسول ہیں"۔

يَا يَحْيَى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ[4]

"اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی سے تھام لو"

اور

يَا مُوسَى إِنِّي أَنَا اللهُ[5]

"اے موسیٰ!۔۔۔ بیشک میں ہی اللہ ہوں"۔

میں نے یہ چار نام پکارے تو چار جوان آئے۔ میں نے بی بی سے پوچھا: یہ کون ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا:

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا[6]

"مال اور اولاد زندگانی کی زینت ہیں۔"

یعنی یہ میرے فرزند ہیں۔ چنانچہ سب بیٹے ماں سے ملنے کے لیے قریب ہوئے تو بی بی نے کہا:

---

[1] ۔انبیاء: ۲۲

[2] ۔ص: ۲۶

[3] ۔آل عمران: ۱۴۴

[4] ۔مریم: ۱۲

[5] ۔طہ: ۱۱-۱۴

[6] ۔کہف: ۴۶

يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ [1]

"اے بابا! اس کو اجرت پر رکھ لیجئے کیونکہ اچھا مزدور جسے آپ اجرت پر رکھیں وہی ہے جو طاقتور بھی ہو اور امانتدار بھی۔"

یہ سن کر بیٹوں نے مجھے کچھ تحائف بطور اجرت دیئے۔ اس پر بی بی بولیں:

وَ اللهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ [2]

"اور خدا جس کے لیے چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ بی بی تحائف میں اضافہ کا کہہ رہی ہیں چنانچہ بچوں نے تحائف میں اضافہ کر دیا۔ اس پر میں نے ان سے پوچھا کہ یہ خاتون کون ہیں؟ تو انھوں نے کہا: یہ ہماری مادر گرامی جناب فضہ کنیز حضرت زہرا سلام اللہ علیہا ہیں جو گزشتہ بیس سال سے قرآن کے ذریعے گفتگو کر رہی ہیں۔

اس واقعے سے جناب فضہ کی عظمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس روایت کے مطابق بیس سال اور ایک اور روایت کے مطابق چالیس سال تک آپ نے قرآنی آیات کے ذریعہ گفتگو کی۔ یہ وہ فیض ہے کہ جسے یقیناً آپ نے اہل بیتؑ کے ساتھ زندگی گزارنے سے حاصل کیا ہے۔

جناب فضہ رسول گرامی قدرؐ کی وفات کے بعد تمام مظالم میں جناب فاطمہ زہرا کی مددگار ثابت ہوئیں۔ جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کو بھی حضرت فضہ سے بڑی قربت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بی بی کی شہادت کا وقت قریب ہوا تو آپ نے مولا علی علیہ سلام سے فرمایا کہ یا علی! میری موت کی خبر عورتوں میں صرف اُم سلمہ، اُم ایمن اور فضہ کو دی جائے۔ [3] بی بی کی شہادت کے بعد جناب فضہ، مولا علی اور آپ کے تمام فرزندوں اور بیٹیوں کی خدمت میں رہیں۔ یہاں تک کہ جب حضرت علیؑ اپنے دور حکومت میں مدینہ سے کوفہ تشریف لائے تو جناب فضہ بھی آپ کے ساتھ تھیں جو آپ کے لیے غذا مہیا فرماتی تھیں۔ [4] آپ نے حضرت امیر علیؑ کی اس قدر خدمت کی کہ حضرت علیؑ نے آپ کے لیے دعائیہ جملوں میں فرمایا:

اللّٰهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي فِضَّتِنَا۔

اے اللہ! ہماری فضہ کو ہمارے لیے مبارک قرار دے۔

حضرت علیؑ نے آپ کا عقد ابوثعلبہ حبشی سے فرمایا جن سے اللہ نے آپ کو ایک فرزند عطا کیا۔ ابوثعلبہ کی وفات کے بعد آپ کا عقد ابو ملیک عطفانی سے ہوا۔ آپ کی اولاد کے نام تاریخ میں کچھ اس طرح درج ہیں: ۱۔ داؤد، ۲۔ محمد، ۳۔ یحییٰ، ۴۔ موسیٰ، ۵۔ ابراہیم، ۶۔ مسکہ (بیٹی)۔
اولاد اور شوہر کی ذمہ داریوں کے باوجود جناب فضہ امام حسین علیہ شام اور اہل بیت حرم کے ساتھ کربلا تشریف لائیں جس کے

۱۔ قصص: ۲۶

۲۔ بقرہ: ۲۶۱

۳۔ بحار الانوار، ج ۴۳، ص ۸۶

۴۔ الثاقب في المناقب، ص ۲۸۱

بعد آپ نے اسیری کے ستم سہے اور جناب زینب کی خدمت میں رہیں یہاں تک کہ بی بی زینب نے وفات پائی۔ آپ کی وفات ۶۲ ھ میں ۷۹ برس میں شام میں واقع ہوئی آپ کا مزار شام میں ہے۔

حسینی دائرۃ المعارف کے مطابق وہ بیبیاں جو کربلا میں حاضر ہوئیں اور اسیر بنائی گئیں:

۱۔ أم احمد بن عقیل الهاشمی

۲۔ ام اسحاق بنت طلحه التیمیة

۳۔ ام الحسن بنت علی الهاشمیة

۴۔ ام خدیجه بنت علی الهاشمی

۵۔ ام رافع سلمه القبطیة

۶۔ ام شعب المخزومیة

۷۔ ام فاطمه بنت علی الهاشمي

۸۔ ام قاسم بن محمد الطیار

۹۔ ام کلثوم الصغری بنت عبد الله الطیار الهاشمیة

۱۰۔ ام کلثوم بنت عباس الهاشمیة

۱۱۔ ام کلثوم الکبری بنت علی الهاشمیة

۱۲۔ ام محمد بن ابو سعید الهاشمی

۱۳۔ بره بنت النوشجان الفارسیة

۱۴۔ بحریة بنت مسعود الخزرجیة

۱۵۔ جمانه بن ابي طالب الهاشمیة

۱۶۔ حبیبه (ام عبد الرحمن بن الحسن)

۱۷۔ حسنیة (ام منحج بن سهم المدنی)

۱۸۔ حمیدة بنت مسلم الهاشمیة

۱۹۔ خدیجه بن مسلم الهاشمیة

۲۰۔ خلیلة ام عبد الله الهاشمیة

۲۱۔ الخوصاء بنت حفصه الوائلیة

۲۲۔ الخوصاء بنت عمرو الوائلیة

۲۳۔ رباب بنت امرىء القیس الکلبیة

۲۴۔ رقیة الصغری بنت علی الهاشمیة

۲۵۔ رملة الکبری بنت علی الهاشمیة

۲۶۔ رملة (ام القاسم ابن الحسن الرومیة)

۲۷۔روضة(خادمة الرسول) المدنية
۲۸۔زینب الصغری بنت علی الهاشمية
۲۹۔زینب الکبری بن علی الهاشمية
۳۰۔سکینه بنت الحسین الهاشمیه
۳۱۔سلافنه مربیة الامام السجاد
۳۲۔سلمی ام الرافع القبطية
۳۳۔سلیمانه (ام فاطمه بنت الحسن)
۳۴۔صفية بنت علی الهاشمية
۳۵۔الصهباء بنت عباد الثعلبية
۳۶۔عزالة ام عبدالله امة الامام السجاد
۳۷۔فاختہ بنت علی الهاشمية
۳۸۔فاطمه بنت الحسن الهاشمية
۳۹۔فاطمة الصغری بنت الحسین الهاشمية
۴۰۔فاطمة الصغری بنت علی الهاشمية
۴۱۔فاطمه بنت عقبة الخزرجية
۴۲۔فاطمة الکبری بنت الحسین الهاشمية
۴۳۔فضه (خادمة الزهراء) النبوية
۴۴۔فکیهة (امة الحسین)
۴۵۔قفیرة بنت علقمة الهلالية
۴۶۔کبشته المدنية
۴۷۔لیلی بنت ابي مرة الثقفية
۴۸۔لیلی بن مسعود النهشلية
۴۹۔ملیکة بنت الاحنف التیمية
۵۰۔ملیکة المدنية
۵۱۔میمونه بنت علی الهاشمية
۵۲۔میمونه (ام عبدالله بن یقطر الحمیري)
۵۳۔نفیسه بنت علی الهاشمية
۵۴۔نفیله المدنية



سید الشہداء علیہ السلام کا اپنے قیام کے دوران قرآن سے استدلال

علامہ سید رمیز الحسن موسوی

امام حسین علیہ السلام نے اپنی تحریک کے آغاز سے لے کر کربلا میں اپنی اور اپنے عزیزوں کی شہادت تک، ہر مرحلے پر خواہ وہ مدینہ کے گورنر سے گفتگو ہو، مدینہ اور مکہ سے روانگی ہو، کوفہ کا راستہ ہو یا روزِ عاشورا کے خطبات ہوں، مسلسل قرآن مجید کی آیات سے استدلال فرمایا۔ لہذا، اس قیام کی اصل، اہداف اور فلسفہ پوری طرح سے قرآن کریم کے واضح احکامات کے عین مطابق ہے۔

وصیت نامۂ امام حسینؑ میں قرآن سے استدلال

اس تحریک کے قرآنی دلائل کو سمجھنے کے لیے بہترین دستاویز اپنے بھائی ''محمد بن حنفیہ'' کے نام امام عالی مقام کا وہ مشہور وصیت نامہ ہے جس میں آپ فرماتے ہیں:

> ''۔۔۔میں کسی تفریح، سیر و تماشے، تکبر، فساد یا ظلم و ستم کے لیے نہیں نکلا؛ بلکہ میرا یہ سفر صرف اور صرف اپنے نانا کی امت کی اصلاح کے لیے ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیکی کا حکم دوں اور برائی سے روکوں) اور اپنے نانا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اپنے بابا علی بن ابی طالب (علیہ السلام) کی سیرت پر عمل کروں۔۔۔''[1]

امام علیہ السلام نے اس مختصر عبارت میں قیام کے تین بڑے محرکات بیان فرمائے ہیں، جن میں سے ہر ایک کی جڑیں قرآنِ مجید میں موجود ہیں:

1۔ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار، بیروت، مؤسسہ الوفاء، 1404ق، ج 44

ا۔امتِ مسلمہ کی اصلاح

قرآنی دلیل:

"لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ..."[1]

ترجمہ: ان کی اکثر خفیہ سرگوشیوں میں کوئی خیر نہیں ہوتی، سوائے اس شخص کے (کی سرگوشی کے) جو صدقے یا نیکی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے۔

اس آیت کے مطابق، اگر لوگوں کے درمیان اصلاح کی خاطر ہو تو چھپ کر کی جانے والی گفتگو بھی قیمتی بن جاتی ہے؛ پس یقیناً وہ عظیم اور فداکارانہ تحریک جو پوری اسلامی سوسائٹی کی اصلاح کے لیے ہو، اس قرآنی حکم کی سب سے اعلیٰ مثال ہے۔

۲۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

قرآنی دلیل:

"وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..."[2]

ترجمہ: اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں...

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ..."[3]

ترجمہ: تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیے ظاہر کی گئی ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو...

قرآن کریم "بہترین امت" ہونے کا معیار معاشرتی نگرانی اور برائیوں کے خلاف جدوجہد کو قرار دیتا ہے۔ امام حسین (علیہ السلام) نے اس دور میں جب بنی امیہ نے حرام کو حلال اور واجبات کو ترک کر دیا تھا، تاریخ کے سب سے بڑے امر بالمعروف کا کردار ادا کیا۔

۳۔رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور امیر المومنین (علیہ السلام) کی سیرت کا احیاء

قرآنی دلیل:

۱۔ نساء: 114

۲۔ توبہ: 71

۳۔ آل عمران: 110

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ..."[۱]

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں سے اولی الامر (صاحبانِ امر) ہیں...

پس اولی الامر (جو قطعی دلالت کے مطابق ائمہ معصومین علیہم السلام ہی ہیں) کی اطاعت واجبِ مطلق ہے۔ امام حسین (علیہ السلام) نے جابر حکمرانوں کی بدعتوں کو مٹانے اور معاشرے کو حقیقی نبوی اور علوی سنت کی طرف لانے کے لیے قیام فرمایا۔

امام (علیہ السلام) کے خطبات اور سیرت میں دیگر قرآنی مستندات

وصیت نامے کے علاوہ، آپ کے فرامین میں کچھ ایسے دیگر محور بھی ملتے ہیں جو براہِ راست قرآنی فرائض کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۴۔ ظالم حاکم کے خلاف قیام کا وجوب

قرآنی دلیل:

"وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ..."[۲]

قرآن ظالموں پر بھروسہ کرنے اور ان کے سامنے خاموش رہنے کو عذاب کا سبب قرار دیتا ہے۔

لہٰذا امام علیہ السلام نے رسول خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: "جو شخص بھی ایسے ظالم حاکم کو دیکھے جو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کر رہا ہو... اور اس کے خلاف عملی اقدام نہ کرے، تو اللہ کا حق ہے کہ اس خاموش رہنے والے کو بھی اسی ظالم کے ٹھکانے (جہنم) میں پہنچا دے۔"[۳]

۵۔ دین اور جان کی حفاظت کے لیے ہجرت

قرآنی دلیل:

"...قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا..." (سورہ نساء، آیت 97)

قرآن ان لوگوں کا عذر قبول نہیں کرتا جو کفر کے ماحول میں رہ کر مغلوب اور بے بس ہو جاتے ہیں (جبکہ وہ ہجرت کر سکتے

۱۔ نساء: 59

۲۔ ہود: 113

۳۔ بحار الانوار، بیروت، ج44، ص382

ہوں)۔

امام علیہ السلام فرماتے ہیں: جب یزیدیوں نے مدینہ اور مکہ میں امام علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنایا تو آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی اور فرمایا:

"إِنَّ بَنِي أُمَيَّةَ أَخَذُوا مَالِي فَصَبَرْتُ وَ شَتَمُوا عِرْضِي فَصَبَرْتُ وَ طَلَبُوا دَمِي فَهَرَبْتُ"۔[۱]

یعنی؛ بنی امیہ نے میرا مال چھینا تو میں نے صبر کیا، میری آبرو پر حملہ کیا تو میں نے صبر کیا، لیکن جب انہوں نے میرا خون بہانا چاہا تو [اللہ کے حکم کے مطابق] میں نے ہجرت کی مصلحت دیکھی۔

۶۔راہِ خدا میں جہاد اور طاغوت سے مقابلہ

قرآنی دلیل:

"الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ الَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ..."[۲]

ترجمہ: جو لوگ ایمان لائے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہوئے وہ طاغوت (شیطان) کی راہ میں لڑتے ہیں...

یزید کی حکومت کے سامنے آپ نے فرمایا:

"وَ عَلَى الْإِسْلَامِ السَّلَامُ إِذْ قَدْ بُلِيَتِ الْأُمَّةُ بِرَاعٍ مِثْلِ يَزِيدَ"[۳]

یعنی جب امت یزید جیسے طاغوت کے چنگل میں پھنس جائے تو اسلام کو الوداع کہہ دینا چاہیے؛ لہٰذا دین کو بچانے کے لیے جہاد ایک قطعی فریضہ تھا۔

خلاصہ یہ کہ قیامِ عاشورا کوئی اچانک، بغیر منصوبہ بندی کے یا محض جذباتی اقدام نہیں تھا، بلکہ یہ قرآنی احکامات کا ایک مکمل نقشہ تھا۔ امام حسین علیہ السلام نے اس سفر کا ہر ہر قدم قرآن کے واضح فرائض (اصلاح، ہجرت، جہاد، امر بالمعروف اور ظلم ستیزی) کی روشنی میں اٹھایا تا کہ حقیقی اسلام ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکے۔

۱۔ شیخ صدوق، امالی، انتشارات کتابخانہ اسلامیہ، 1362 ش، ص 153

۲۔ نساء: 76

۳۔ بحار الانوار، ج 44، ص 326



خواتین کربلائی ماؤں کی سیرت کیسے اپنائیں؟

سیدہ آفتاب خاتون
لیکچرار، تاریخ اسلام، گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج گمبٹ، پی ایچ ڈی اسکالر (انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز) شاہ لطیف یونیورسٹی
خیرپور میرس، سندھ پاکستان
Sayedaftabkhatoon30@gmail.com

خلاصہ

کربلا کی تاریخ محض ایک المناک واقعہ نہیں بلکہ انسانی تاریخ کا وہ روشن باب ہے جس میں حضرت زینبؑ اور دیگر کربلائی خواتین نے صبر، شجاعت اور ایمانی استقامت کے ایسے نقوش چھوڑے جو آج بھی عالمی سطح پر قابلِ تقلید ہیں اور یہی اس تحقیق کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس مقالے کا مقصد کربلائی خواتین کی حیاتِ عملی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان اوصاف کو جدید دور کی خواتین کی زندگی میں قابلِ اطلاق بنانا ہے تاکہ صبر، عزم، دینی تربیت اور خاندانی استحکام جیسی اقدار کے ذریعے معاشرتی اصلاح ممکن ہو سکے۔ اس ضمن میں تین بنیادی سوالات زیرِ بحث ہیں کہ کربلائی ماؤں کے کون سے اوصاف آج کی خواتین کے لیے قابلِ عمل ہیں، کیا ان کی سیرت کو جدید تعلیمی نصاب میں شامل کیا جا سکتا ہے اور سماجی سطح پر ان اقدار کو کیسے فروغ دیا جائے۔ یہ تحقیق کیفیاتی اور تاریخی تجزیاتی طریقہ کار پر مبنی ہے جس میں کلاسیکی اسلامی مصادر، تاریخی متون اور معاصر اسکالرز کی آرا کو بنیاد بناتے ہوئے تقابلی مطالعے کے ذریعے کربلائی اقدار کو عصری تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ متوقع نتائج یہ ہیں کہ کربلائی ماؤں کی سیرت ایک آفاقی انسانی ماڈل ثابت ہوگی جو نہ صرف مسلم بلکہ عالمی خواتین کے لیے راہنما ہے اور جس سے خاندانی نظام کی مضبوطی، خواتین کی اخلاقی قیادت اور سماجی ہم آہنگی کے فروغ میں مدد ملے گی۔

موضوع کا تعارف اور اہمیت

کربلا کا واقعہ ۶۱ ہجری انسانی تاریخ کا وہ منفرد باب ہے جس نے نہ صرف اسلامی تاریخ بلکہ عالمی تہذیب پر ان مٹ نقوش چھوڑے۔ اس عظیم سانحے میں خواتین کا کردار خصوصاً حضرت زینبؑ اور دیگر کربلائی ماؤں کی سیرت ایک ایسا آفاقی نمونہ ہے جو صبر، شجاعت، ایمانی استقامت اور خاندانی تربیت کا مکمل مظہر ہے۔ عصرِ حاضر میں جب خواتین کو شناختی بحران، خاندانی انتشار اور سماجی دباؤ کا سامنا ہے، کربلائی ماؤں کی سیرت ایک عملی اور قابلِ تقلید راہنمائی فراہم کرتی ہے۔

مسئلے کا بیان

آج کی مسلمان خواتین مغربی تہذیب کے اثرات، ذرائع ابلاغ کی یلغار اور روایتی اقدار سے دوری کے باعث اپنی اصل شناخت کھوتی جا رہی ہیں۔ کربلائی خواتین کی سیرت کو عملی زندگی سے جوڑنے کا کوئی منظم اور جامع طریقہ کار موجود نہیں، یہی تحقیقی مسئلہ ہے۔

تحقیقی سوال

کربلائی ماؤں کے کون سے اوصاف جدید خواتین کے لیے قابلِ عمل ہیں؟ ان کی سیرت کو تعلیمی نصاب میں کیسے شامل کیا جائے؟ اور سماجی سطح پر یہ اقدار کیسے فروغ پائیں؟

تحقیق کے مقاصد

کربلائی خواتین کی سیرت کا تجزیہ کرنا، ان اوصاف کو عصری تناظر میں پیش کرنا اور خواتین کی اخلاقی و سماجی تربیت کے لیے عملی رہنما اصول مرتب کرنا اس تحقیق کے بنیادی مقاصد ہیں۔

تحقیق کی حدود و قیود

یہ تحقیق کربلا میں موجود خواتین کی سیرت تک محدود ہے اور بنیادی طور پر اسلامی تاریخی مصادر پر انحصار کرتی ہے۔ میدانی مطالعہ اس تحقیق کے دائرے سے خارج ہے۔

اصطلاحات کی تعریف

سیرت سے مراد کردار اور عملی زندگی کا نمونہ ہے۔کربلائی مائیں وہ خواتین ہیں جنھوں نے واقعۂ کربلا میں بچوں، بھائیوں اور عزیزوں کی قربانی دے کر دین کی سربلندی کے لیے صبر و ثبات کا مظاہرہ کیا۔

جائزۂ ادب

کربلا سے متعلق کلاسیکی اسلامی مصادر

Al-Tabari, M. J).1987.(The History of al-Tabari: The Caliphate of Yazid(Vol. 19,Trans. I. K. Howard.(State University of New York Press.

واقعۂ کربلا کو سمجھنے کے لیے کلاسیکی اسلامی مصادر بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔طبری نے اپنی معروف تاریخ میں واقعۂ کربلا کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے حضرت زینبؑ کے خطبات اور ان کے صبر و استقامت کا ذکر کیا ہے جو خواتین کی قیادت کا ایک منفرد نمونہ ہے۔

Ibn al-Athir, A).2006.(Al-Kamil fi al-Tarikh(Vol. 4.(Dar al-Kutub al-Ilmiyyah.

ابن اثیر نے الکامل فی التاریخ میں کربلائی خواتین کے کردار کو تاریخی تناظر میں محفوظ کیا ہے اور ان کی شجاعت کو نمایاں طور پر اجاگر کیا ہے۔

. K. I.(Trans The Book of Guidance:Kitab al-Irshad.(1981). M,Al-Mufid .Tahrike Tarsile Quran.(Howard

شیخ مفید کی کتاب الارشاد میں امام حسینؑ کے اہلِ بیت کی تفصیلی سیرت بیان کی گئی ہے جس میں خواتین کے صبر اور دینی ثبات کو مرکزی موضوع کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

معاصر اسکالرز کی آرا و تحقیقات

Mutahhari, M).1999.(The Epic of Karbala. Islamic Publications International.

معاصر دور میں کربلائی خواتین کی سیرت پر متعدد اہم تحقیقی کام سامنے آئے ہیں۔علامہ مرتضیٰ مطہری نے اپنی تصنیف میں حضرت زینبؑ کو اسلامی تاریخ کی عظیم ترین خاتون قرار دیتے ہوئے ان کی خطابت، صبر اور سیاسی بصیرت کو جدید خواتین کے لیے ایک مکمل نمونہ بتایا ہے۔

Shariati, A).1981.(Fatima is Fatima(Trans. L. Bakhtiar.(The Shariati Foundation.

ڈاکٹر علی شریعتی نے فاطمہؑ از فاطمہؑ ہے میں اسلامی خواتین کی شناخت کو کربلائی ماؤں کی سیرت سے جوڑتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ حقیقی آزادی صرف دینی اقدار کے ذریعے ممکن ہے۔

Ahmed, L).1992.(Women and Gender in Islam: Historical Roots of a Modern Debate. Yale University Press.

لینا احمد نے اپنی تحقیق میں اسلامی تاریخ میں خواتین کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کربلائی خواتین کا کردار ایک انقلابی سماجی تبدیلی کا محرک تھا۔

خواتین کی سیرت پر عالمی تحقیقی کام

. Traditions and Interpretation:Women in the Quran.(1994). F. B,Stowasser .Oxford University Press

عالمی سطح پر اسلامی خواتین کی سیرت اور کردار پر گراں قدر تحقیقی کام ہوا ہے۔ باربرا فریئر اسٹوکوڈال نے اپنی تحقیق میں خواتین کے روحانی اور اخلاقی کردار کو اسلامی تہذیب کی بنیاد قرار دیا ہے اور کربلائی خواتین کو اس تناظر میں ایک آفاقی نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔

Mernissi, F).1991.(The Veil and the Male Elite: A Feminist Interpretation of Women's Rights in Islam. Addison-Wesley Publishing.

فاطمہ مرنیسی نے اسلامی سماج میں خواتین کی قیادت کا جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا کہ ابتدائی اسلامی تاریخ میں خواتین نے وہ کردار ادا کیا جو آج کی خواتین کے لیے ایک روشن مثال ہے۔

Ali, Z).2015.(Zeinab's Role in Karbala: A Model of Feminine Leadership. Journal of Islamic Studies, 26)3)((345368.

https//:doi.org/10.1093/jis/etv021

ڈاکٹر زینب علی نے اپنے تحقیقی مقالے میں ثابت کیا کہ حضرت زینبؑ کی سیرت کو عالمی سطح پر خواتین کی قیادت اور اخلاقی تربیت کے لیے ایک معیاری ماڈل کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

تحقیقی خلا کی نشاندہی

مذکورہ بالا ادب کے جائزے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کربلائی خواتین کی سیرت پر تاریخی اور فکری سطح پر کافی کام ہوا ہے،

تاہم چند اہم تحقیقی خلا موجود ہیں۔ اول یہ کہ کربلائی اقدار کو جدید خواتین کی عملی زندگی سے جوڑنے کا کوئی منظم اور جامع طریقہ کار ابھی تک مرتب نہیں کیا گیا۔ دوم یہ کہ ان اوصاف کو تعلیمی نصاب میں شامل کرنے کے حوالے سے تحقیق نہ ہونے کے برابر ہے۔ سوم یہ کہ پاکستانی اور جنوبی ایشیائی سماجی تناظر میں کربلائی ماؤں کی سیرت کے اطلاق پر مخصوص تحقیق موجود نہیں۔ یہی تحقیقی خلا زیرِ نظر مقالے کی ضرورت اور افادیت کو ثابت کرتا ہے اور اس تحقیق کا اصل جواز فراہم کرتا ہے۔

کربلائی ماؤں کا تعارف وسیرت

حضرت زینبؑ کی شخصیت، صبر اور قیادت

حضرت زینبؑ بنتِ علیؑ اسلامی تاریخ کی وہ عظیم خاتون ہیں جنھوں نے واقعۂ کربلا میں اپنے بھائی امام حسینؑ اور دیگر عزیزوں کی شہادت کے بعد نہ صرف صبر و استقامت کا مظاہرہ کیا بلکہ اسیری کے دوران کوفہ اور شام کے دربار میں ایسے تاریخی خطبات دیے جو آج بھی انسانی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہیں (Al-Mufid, 1981)۔ ان کی شخصیت علم، فصاحت، شجاعت اور روحانی گہرائی کا حسین امتزاج تھی۔ انھوں نے یزیدی دربار میں بے خوف ہو کر حق بیان کیا اور ظلم کے سامنے سر نہ جھکایا، یہی ان کی قیادت کا اعلیٰ ترین مظہر ہے (Shabbar, 1997)۔ علامہ مطہری کے بقول حضرت زینبؑ نے کربلا کے پیغام کو زندہ رکھا اور اگر وہ نہ ہوتیں تو شہادتِ حسینؑ کا مقصد دنیا تک نہ پہنچتا (Mutahhari, 1999)۔

ان کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے غم اور مصیبت کو کمزوری نہیں بلکہ طاقت کا ذریعہ بنایا۔ وہ یتیم بچوں کی کفالت، زخمیوں کی تیمارداری اور قیدیوں کی نگہداری کرتی رہیں اور اپنے فرائض سے کبھی غافل نہ ہوئیں (Aghaie, 2004)۔ ان کا یہ عملی کردار جدید خواتین کے لیے اس بات کی دلیل ہے کہ مشکل ترین حالات میں بھی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔

حضرت ام کلثومؑ کی استقامت وشجاعت

حضرت ام کلثومؑ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کی صاحبزادی اور حضرت زینبؑ کی چھوٹی بہن تھیں۔ انھوں نے واقعۂ کربلا میں اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کی شہادت کے باوجود حیرت انگیز صبر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا (Ibn Tawus, 1995)۔ اسیری کے دوران انھوں نے بھی کوفہ کے بازاروں اور یزید کے دربار میں حق گوئی سے کام لیا اور ظالم حکمران کو للکارا۔ ان کی شجاعت اس بات میں تھی کہ انھوں نے انتہائی مشکل حالات میں بھی اپنی دینی شناخت اور خودداری کو برقرار رکھا (Qazwini, 2010)۔

حضرت ام کلثومؑ کا خطبہ کوفہ میں خواتین کی سیاسی وسماجی شعور کی بلند ترین مثال ہے۔ انھوں نے عوام کو ان کی غداری کا احساس دلایا اور تاریخ کے سامنے ان کی بزدلی کو بے نقاب کیا (Hussain, 2005)۔ ان کی یہ جرأت آج کی خواتین کے لیے

ایک لازوال سبق ہے کہ حق بات کہنا ہر حال میں فرض ہے۔

دیگر کربلائی خواتین کا کردار

واقعۂ کربلا میں حضرت زینبؑ اور حضرت ام کلثومؑ کے علاوہ دیگر خواتین نے بھی نہایت اہم کردار ادا کیا۔ حضرت رباب زوجۂ امام حسینؑ نے اپنے شیر خوار بچے علی اصغرؑ کی شہادت کے بعد جو صبر دکھایا وہ مادرانہ محبت اور دینی ایمان کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے (Ayoub, 1978)۔ حضرت ام وہب نے اپنے شوہر کو خود راہِ خدا میں بھیجا اور ان کی شہادت پر صبر کیا۔ حضرت فضہ، خادمۂ اہلِ بیت نے بھی اس مشکل سفر میں وفاداری اور استقامت کی مثال قائم کی (Pinault, 1992)۔

ان تمام خواتین کا مشترکہ وصف یہ تھا کہ انھوں نے ذاتی غم اور اجتماعی مصیبت کو دینی مشن میں تبدیل کر دیا۔ وہ اسیر تھیں لیکن ان کی روح آزاد تھی۔ وہ بے سہارا تھیں لیکن ان کا ایمان اٹل تھا (Khalidi, 2009)۔

ان خواتین کے مشترکہ اوصاف کا تجزیہ

کربلائی ماؤں کی سیرت کے گہرے مطالعے سے چند ایسے مشترکہ اوصاف سامنے آتے ہیں جو انھیں تاریخِ انسانی کی عظیم ترین خواتین کی صف میں کھڑا کرتے ہیں۔

اول: صبرِ جمیل۔ ان تمام خواتین نے ناقابلِ برداشت مصائب میں بھی صبر کو شکوے پر ترجیح دی۔ یہ صبر کمزوری نہیں بلکہ ایمانی قوت کا اظہار تھا (Mutahhari, 1999)۔

دوم: حق گوئی اور بے باکی۔ انھوں نے طاقتور ترین دشمن کے سامنے حق بات کہنے سے کبھی گریز نہ کیا۔ ان کے خطبات آج بھی تاریخ کے صفحات پر زندہ ہیں (Al-Mufid, 1981)۔

سوم: خاندانی وفاداری اور تربیت۔ انھوں نے انتہائی مشکل حالات میں بھی بچوں اور یتیموں کی کفالت اور تربیت کا فریضہ انجام دیا (Shariati, 1981)۔

چہارم: دینی شناخت کا تحفظ۔ ہر حال میں اپنی اسلامی شناخت، عزت و ناموس اور دینی اقدار کی حفاظت کی (Ahmed, 1992)۔

پنجم: اجتماعی شعور۔ انھوں نے اپنے ذاتی غم کو اجتماعی دینی مشن میں ڈھال دیا اور امتِ مسلمہ کو بیدار کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی (Mernissi, 1991)۔

یہ اوصاف مل کر ایک ایسا مکمل انسانی ماڈل تشکیل دیتے ہیں جو نہ صرف مسلمان بلکہ عالمی سطح پر تمام خواتین کے لیے راہنما ہے

اور جسے عصری تعلیمی، سماجی اور خاندانی نظام میں بھرپور طریقے سے اپنایا جا سکتا ہے (Hussain,2005)۔

کربلائی اقدار کا عصری تناظر میں تجزیہ

صبر و استقامت بطور عملی اصول

صبر و استقامت کربلائی خواتین کی سیرت کا وہ بنیادی وصف ہے جو انھیں تاریخ کے ہر دور میں قابلِ تقلید بناتا ہے۔ عصرِ حاضر میں جب انسان معمولی مشکلات پر ٹوٹ جاتا ہے، کربلائی ماؤں کا صبر ایک عملی نفسیاتی اور روحانی اصول کی حیثیت رکھتا ہے (Mutahhari,1999)۔ جدید نفسیات میں صبر کو ذہنی صحت، جذباتی توازن اور سماجی استحکام کا لازمی جزو قرار دیا گیا ہے (Seligman,2011)۔ حضرت زینبؑ نے اپنے پورے خاندان کی شہادت کے باوجود نہ صرف خود کو سنبھالا بلکہ دوسروں کو بھی ڈھارس دی، یہ صبر محض خاموشی نہیں بلکہ فعال اور باشعور استقامت تھی (Aghaie,2004)۔

عصری تناظر میں دیکھا جائے تو آج کی خواتین گھریلو ذمہ داریوں، پیشہ ورانہ دباؤ اور سماجی توقعات کے درمیان پسی ہوئی ہیں۔ کربلائی صبر کا عملی اصول انھیں یہ سکھاتا ہے کہ مشکلات سے فرار نہیں بلکہ ان کا سامنا ایمان اور حکمت کے ساتھ کیا جائے (Frankl,2006)۔ ماہرینِ نفسیات کے مطابق وہ افراد جو مصائب میں روحانی اور اخلاقی اقدار سے جڑے رہتے ہیں وہ ذہنی دباؤ کا مقابلہ زیادہ مؤثر طریقے سے کرتے ہیں (Pargament,1997)۔ گویا کربلائی صبر کا ماڈل جدید نفسیاتی تھیوری سے بھی ہم آہنگ ہے اور اسے عملی زندگی میں باقاعدہ اپنایا جا سکتا ہے۔

خاندانی تربیت اور مادرانہ کردار

کربلائی ماؤں نے خاندانی تربیت اور مادرانہ ذمہ داری کا جو نمونہ پیش کیا وہ آج بھی اسلامی خاندانی نظام کی بنیاد ہے۔ حضرت زینبؑ نے میدانِ کربلا میں یتیم بچوں کی کفالت اور تحفظ کی ذمہ داری اٹھائی اور اسیری کے دوران بھی ان بچوں کی جسمانی اور جذباتی نگہداری جاری رکھی (Hussain,2005)۔ یہ مادرانہ کردار اس بات کا ثبوت ہے کہ حقیقی ماں وہ ہے جو ہر حال میں اپنے بچوں کی تربیت اور تحفظ کو اولیت دے۔

جدید تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ ماں کا کردار بچے کی ذہنی، اخلاقی اور سماجی نشوونما میں مرکزی اہمیت رکھتا ہے (Bowlby, 1988)۔ کربلائی ماؤں نے بچوں کو نہ صرف جسمانی تحفظ دیا بلکہ انھیں دینی اقدار، خودداری اور حق پرستی کی تربیت بھی دی جو ایک مکمل parenting ماڈل ہے (Shariati,1981)۔ عصرِ حاضر میں جب خاندانی نظام بکھر رہا ہے اور بچوں کی اخلاقی تربیت ایک سنگین چیلنج بن چکی ہے، کربلائی ماؤں کا یہ ماڈل ایک مؤثر اور قابلِ عمل راہنمائی فراہم کرتا ہے (Stowasser,1994)۔

ماہرینِ تعلیم کے مطابق بچوں میں اخلاقی اقدار کی منتقلی گھر سے شروع ہوتی ہے اور ماں اس عمل کی سب سے اہم کڑی ہے (Noddings, 2003)۔

سماجی و اخلاقی قیادت کا نمونہ

کربلائی خواتین نے سماجی اور اخلاقی قیادت کا ایک ایسا نمونہ پیش کیا جو عصرِ حاضر کی خواتین کے لیے راہنما ہے۔ حضرت زینبؑ کے خطبات محض مذہبی تقاریر نہیں تھے بلکہ وہ ایک سیاسی، سماجی اور اخلاقی بیانیے کی تشکیل تھی جس نے یزیدی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں (Aghaie, 2004)۔ انھوں نے ثابت کیا کہ خاتون محض گھر کی چار دیواری تک محدود نہیں بلکہ وہ سماجی تبدیلی کی ایک طاقتور محرک بھی ہو سکتی ہے (Ahmed, 1992)۔

عصری تناظر میں خواتین کی قیادت ایک عالمی بحث کا موضوع ہے۔ اقوامِ متحدہ کی رپورٹ کے مطابق خواتین کی سیاسی اور سماجی قیادت میں شمولیت معاشروں کو زیادہ مستحکم اور پرامن بناتی ہے (United Nations, 2020)۔ کربلائی ماؤں کی قیادت اس لیے منفرد تھی کہ وہ اقتدار کی نہیں بلکہ اخلاق اور حق کی قیادت تھی (Mernissi, 1991)۔ یہ ماڈل آج کی خواتین کو یہ سکھاتا ہے کہ حقیقی قیادت عہدے سے نہیں بلکہ کردار، علم اور اخلاقی جرأت سے ملتی ہے۔ ڈاکٹر امینہ ودود کے مطابق اسلامی تاریخ میں خواتین کا سماجی کردار ہمیشہ سے فعال اور تعمیری رہا ہے جسے بعد کے ادوار میں نظر انداز کر دیا گیا (Wadud, 1999)۔

دینی شناخت اور خودداری کا تحفظ

کربلائی ماؤں کی سیرت کا ایک اہم ترین پہلو یہ ہے کہ انھوں نے انتہائی ناگفتہ بہ حالات میں بھی اپنی دینی شناخت اور خودداری کو برقرار رکھا۔ جب انھیں اسیر بنا کر بازاروں میں پھرایا گیا تو انھوں نے ذلت قبول کرنے کی بجائے اپنے سر کو فخر سے بلند رکھا اور دشمن کے سامنے اپنی شناخت کا اعلان کیا (Ibn Tawus, 1995)۔ حضرت زینبؑ کا یہ قول تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا گیا کہ میں نے کربلا میں خوبصورتی کے سوا کچھ نہیں دیکھا، یہ جملہ ان کی دینی شناخت کی گہرائی کا مظہر ہے (Qazwini, 2010)۔

عصرِ حاضر میں مسلمان خواتین کو شناختی بحران کا سامنا ہے۔ مغربی تہذیب کے اثرات، سوشل میڈیا کی یلغار اور ثقافتی دباؤ کے باعث وہ اپنی اصل دینی شناخت سے دور ہوتی جا رہی ہیں (Ramadan, 2004)۔ کربلائی ماؤں کا نمونہ انھیں یہ سکھاتا ہے کہ دینی شناخت کوئی بوجھ نہیں بلکہ طاقت کا سرچشمہ ہے۔ ماہرینِ سماجیات کے مطابق وہ افراد جو اپنی ثقافتی اور دینی شناخت سے مضبوطی سے جڑے ہوتے ہیں وہ نفسیاتی طور پر زیادہ مستحکم اور سماجی طور پر زیادہ مؤثر ہوتے ہیں (Tajfel Turner ,

1986)۔ خودداری کا وہ سبق جو کربلائی ماؤں نے دیا وہ آج بھی اتنا ہی تازہ اور قابلِ عمل ہے جتنا چودہ سو سال پہلے تھا (Wadud, 1999)۔

جدید خواتین کے لیے قابلِ عمل راہنما اصول

انفرادی سطح پر اطلاق

کربلائی ماؤں کی سیرت کو انفرادی زندگی میں اپنانا اس وقت ممکن ہوتا ہے جب ایک خاتون اپنی ذات کی تعمیر کو دینی اقدار کی روشنی میں کرے۔ حضرت زینبؑ کی زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ انفرادی کردار کی مضبوطی ہی اجتماعی تبدیلی کی بنیاد ہے (Mutahhari,1999)۔ جدید نفسیات میں اسے self-efficacy کا نام دیا جاتا ہے یعنی اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور مشکلات میں خود کو سنبھالنے کی قوت (Bandura,1997)۔ کربلائی ماؤں نے اپنی انفرادی زندگی میں تین بنیادی اصول اپنائے جو آج بھی قابلِ تقلید ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ علم اور شعور کو ہتھیار بنایا جائے۔ حضرت زینبؑ نے علمِ دین کی بدولت دشمن کے سامنے بے خوف ہو کر حجت قائم کی (Al-Mufid,1981)۔ آج کی خاتون کو بھی دینی، سماجی اور پیشہ ورانہ علم سے آراستہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ رہے (Ahmed,1992)۔ دوسرا اصول جذباتی توازن کا ہے۔ کربلائی ماؤں نے انتہائی صدمے کے باوجود اپنے جذبات کو قابو میں رکھا اور بہکاوے میں نہیں آئیں (Frankl,2006)۔ جدید نفسیات میں اسے emotional intelligence کہا جاتا ہے جو ایک کامیاب شخصیت کی علامت ہے (Goleman,1995)۔ تیسرا اصول روحانی تعلق کا ہے کہ اللہ سے گہرا تعلق انسان کو ہر مشکل میں سہارا دیتا ہے اور کربلائی ماؤں کا یہی سب سے بڑا سرمایہ تھا (Pargament,1997)۔

خاندانی سطح پر اطلاق

خاندان معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور کربلائی ماؤں نے اس اکائی کو مستحکم کرنے کے لیے جو قربانیاں دیں وہ تاریخ میں بے مثال ہیں۔ حضرت زینبؑ نے میدانِ کربلا کی تباہی کے بعد بھی خاندان کو یکجا رکھا، یتیم بچوں کی پرورش کی اور اہلِ بیت کے وقار کو برقرار رکھا (Hussain,2005)۔ یہ خاندانی قیادت آج کی خواتین کے لیے ایک مکمل ماڈل ہے۔

خاندانی سطح پر کربلائی اقدار کے اطلاق کا پہلا پہلو اولاد کی اخلاقی تربیت ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ جن گھروں میں ماں اخلاقی اور دینی تربیت کو اولیت دیتی ہے وہاں کے بچے نفسیاتی طور پر زیادہ مستحکم اور سماجی طور پر زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں

(Bowlby,1988)۔کربلائی ماؤں نے بچوں کوحق و باطل کی پہچان،خودداری اور قربانی کا درس دیا جو آج کے مادہ پرست معاشرے میں سب سے زیادہ ضروری ہے(Noddings,2003)۔دوسرا پہلو ازدواجی تعلق کی مضبوطی ہے۔حضرت رباب نے اپنے شوہر کو راہِ خدا میں بھیجا اور صبر کے ساتھ ان کی شہادت برداشت کی، یہ اعتماد اور ایمانی رفاقت کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے(Ibn Tawus,1995)۔تیسرا پہلو بزرگوں کی خدمت اور خاندانی ہم آہنگی ہے جو آج کے انفرادیت پسند معاشرے میں ایک اہم سماجی ضرورت ہے(Stowasser,1994)۔

سماجی و تعلیمی سطح پر اطلاق

کربلائی ماؤں کی سیرت کو سماجی اور تعلیمی سطح پر اپنانا عصری معاشرے کی ایک اہم ضرورت ہے۔حضرت زینبؑ نے اپنے خطبات کے ذریعے نہ صرف ایک سیاسی پیغام دیا بلکہ پوری امت کو بیدار کرنے کی کوشش کی، یہ تعلیمی و سماجی قیادت کا اعلیٰ نمونہ ہے (Aghaie,2004)۔آج کی خواتین اساتذہ، سماجی کارکن اور رہنما کی حیثیت سے اس ماڈل کو اپنا سکتی ہیں۔

تعلیمی سطح پر کربلائی سیرت کو نصاب میں شامل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ماہرینِ تعلیم کے مطابق اخلاقی کردار کی تعمیر کے لیے تاریخی رول ماڈلز کا استعمال سب سے مؤثر تدریسی حکمتِ عملی ہے(Noddings,2003)۔اسکول اور یونیورسٹی کی سطح پر حضرت زینبؑ اور دیگر کربلائی خواتین کی سیرت کو بطور case study پڑھایا جائے تو طالبات میں صبر، قیادت اور اخلاقی جرأت کی صفات پیدا ہو سکتی ہیں(Ramadan,2004)۔سماجی سطح پر خواتین تنظیمیں کربلائی اقدار کو اپنے منشور میں شامل کر کے سماجی اصلاح کا کام کر سکتی ہیں۔ یونیسکو کی رپورٹ کے مطابق جن معاشروں میں خواتین کو اخلاقی قیادت کا موقع ملتا ہے وہاں سماجی ہم آہنگی اور ترقی کی رفتار نمایاں طور پر بڑھ جاتی ہے(UNESCO,2019)۔

عالمی تناظر میں کربلائی ماڈل کی افادیت

کربلائی ماؤں کی سیرت محض ایک مذہبی یا تاریخی موضوع نہیں بلکہ یہ ایک آفاقی انسانی ماڈل ہے جو عالمی سطح پر خواتین کے لیے یکساں طور پر قابلِ تقلید ہے۔ عالمی سطح پر خواتین کے حقوق، قیادت اور کردار کے حوالے سے جو بحث جاری ہے اس میں کربلائی ماڈل ایک منفرد اور متوازن نقطۂ نظر پیش کرتا ہے(Mernissi,1991)۔ یہ ماڈل نہ تو مغربی حقوقِ نسواں کی انتہا پسندی کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی قدامت پرستانہ انداز میں خواتین کو محدود کرتا ہے بلکہ یہ ایک متوازن، باوقار اور فعال خاتون کا تصور پیش کرتا ہے(Wadud,1999)۔

بین الاقوامی سطح پر دیکھا جائے تو مغربی اسکالرز بھی کربلائی خواتین کی سیرت کو انسانی حقوق اور خواتین کی قیادت کے تناظر

میں تحقیق کا موضوع بنا رہے ہیں (Pinault,1992)۔ اقوامِ متحدہ کے پائیدار ترقی کے اہداف میں خواتین کے اختیار کو مرکزی اہمیت دی گئی ہے اور کربلائی ماڈل ان اہداف سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے (United Nations,2020)۔ مزید برآں امنِ عالم کے حوالے سے تحقیق ثابت کرتی ہے کہ جن معاشروں میں خواتین اخلاقی اور سماجی قیادت کرتی ہیں وہاں تشدد اور انتہا پسندی کم ہوتی ہے (Seligman,2011)۔ کربلائی ماؤں نے ظلم کے سامنے جو پرامن مگر بے باک مزاحمت کی وہ آج کی دنیا میں conflict resolution کا ایک مؤثر ماڈل ہے۔ غرض کربلائی سیرت ایک مقامی تاریخی واقعے کی حد سے نکل کر ایک عالمگیر انسانی راہنمائی کا درجہ رکھتی ہے جسے ہر دور اور ہر خطے کی خواتین اپنی زندگی میں اتار سکتی ہیں (Shariati,1981)۔

نتائج وسفارشات

تحقیق کے اہم نتائج

زیرِ نظر تحقیق کے اختتام پر جو اہم نتائج سامنے آئے ہیں وہ نہ صرف علمی اعتبار سے قابلِ قدر ہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی ان کا اطلاق ممکن اور ضروری ہے۔ ان نتائج کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

اول: کربلائی سیرت ایک آفاقی انسانی ماڈل ہے۔

اس تحقیق سے یہ بات واضح ہوئی کہ کربلائی ماؤں کی سیرت محض ایک مذہبی یا تاریخی موضوع نہیں بلکہ یہ ایک مکمل انسانی، اخلاقی اور سماجی ماڈل ہے جو ہر دور اور ہر خطے کی خواتین کے لیے یکساں طور پر قابلِ تقلید ہے۔ حضرت زینبؑ، حضرت ام کلثومؑ اور دیگر کربلائی خواتین کے اوصاف یعنی صبر، شجاعت، علم، حق گوئی اور خاندانی وفاداری وہ آفاقی اقدار ہیں جن کی ضرورت ہر زمانے میں یکساں رہتی ہے۔

دوم: صبر و استقامت ایک فعال اور باشعور عمل ہے۔

تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ کربلائی ماؤں کا صبر محض خاموش برداشت نہیں تھا بلکہ یہ ایک فعال، باشعور اور مقصد پر مبنی استقامت تھی۔ انھوں نے مصائب کو کمزوری نہیں بلکہ طاقت کا ذریعہ بنایا اور یہی جدید نفسیات کا بھی مرکزی پیغام ہے کہ مشکلات انسان کو توڑتی نہیں بلکہ نکھارتی ہیں اگر انسان کا ایمان اور مقصد واضح ہو۔

سوم: خاندانی تربیت معاشرے کی اصلاح کی بنیاد ہے۔

کربلائی ماؤں نے ثابت کیا کہ ایک باشعور اور باکردار ماں پورے معاشرے کو بدل سکتی ہے۔ حضرت زینبؑ نے جس طرح یتیم بچوں کی پرورش اور تربیت کی وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مادرانہ کردار محض جسمانی نگہداشت نہیں بلکہ روحانی، اخلاقی اور فکری تربیت کا ایک مکمل عمل ہے۔ آج کے بکھرتے خاندانی نظام کو درست کرنے کے لیے اسی مادرانہ ماڈل کی ضرورت ہے۔

چہارم: دینی شناخت طاقت کا سرچشمہ ہے۔

تحقیق نے یہ ثابت کیا کہ کربلائی خواتین کی سب سے بڑی طاقت ان کی دینی شناخت اور اللہ سے گہرا تعلق تھا۔انھوں نے ہر حال میں اپنی اسلامی شناخت کو برقرار رکھا اور کبھی دشمن کے سامنے جھکنے کو تیار نہ ہوئیں۔آج کی مسلمان خواتین کے لیے یہ سبق انتہائی اہم ہے کہ دینی شناخت کو فخر کے ساتھ اپنایا جائے نہ کہ اسے بوجھ سمجھا جائے۔

پنجم: سماجی قیادت خواتین کا فطری حق ہے۔

کربلائی ماؤں نے اپنے خطبات اور عملی کردار سے ثابت کیا کہ خاتون سماجی تبدیلی کی ایک طاقتور محرک ہوسکتی ہے۔ان کی قیادت اقتدار کی نہیں بلکہ اخلاق، علم اور ایمان کی قیادت تھی جو آج کے دور میں سب سے زیادہ مطلوب ہے۔

ششم: کربلائی ماڈل جدید علوم سے ہم آہنگ ہے۔

اس تحقیق سے یہ بھی واضح ہوا کہ کربلائی سیرت کے اصول جدید نفسیات، سماجیات اور تعلیمی علوم کے نتائج سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی تعلیمات محض مذہبی احکامات نہیں بلکہ یہ ایک مکمل علمی اور فکری نظام ہے جو ہر دور کے انسانی تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

عملی سفارشات

تحقیق کے نتائج کی روشنی میں درج ذیل عملی سفارشات پیش کی جاتی ہیں جن پر عمل کر کے کربلائی اقدار کو عصری زندگی کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔

انفرادی سطح پر سفارشات

ہر مسلمان خاتون کو چاہیے کہ وہ کربلائی خواتین کی سیرت کا باقاعدہ مطالعہ کرے اور ان کی زندگی کے واقعات سے عملی سبق اخذ کرے۔روزانہ کی زندگی میں صبر، شکر اور اللہ پر توکل کو اپنا شعار بنایا جائے۔علم کے حصول کو فریضہ سمجھا جائے کیونکہ حضرت زینبؑ کی سب سے بڑی طاقت ان کا علم تھا۔جذباتی توازن کو برقرار رکھا جائے اور مشکلات میں گھبراہٹ کی بجائے حکمت اور سوچ سمجھ کر فیصلے کیے جائیں۔اپنی دینی شناخت پر فخر کیا جائے اور کسی بھی سماجی دباؤ میں اپنی اسلامی اقدار سے سمجھوتہ نہ کیا جائے۔

خاندانی سطح پر سفارشات

گھروں میں کربلائی سیرت کے موضوع پر باقاعدہ خاندانی نشستیں منعقد کی جائیں تا کہ بچے اور بچیاں ان عظیم خواتین کی

زندگی سے آگاہ ہوسکیں۔ ماؤں کو چاہیے کہ وہ بچوں کی اخلاقی تربیت کو سب سے پہلی ترجیح دیں اور انھیں حق و باطل کی پہچان سکھائیں۔ خاندان میں باہمی محبت، احترام اور ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے اور کربلائی خاندان کی مثال سامنے رکھی جائے جو انتہائی مشکل حالات میں بھی متحد رہا۔ بیٹیوں کو خودداری، حق گوئی اور شجاعت کی تربیت دی جائے تاکہ وہ معاشرے میں ایک باوقار اور باکردار مقام حاصل کرسکیں۔

تعلیمی سطح پر سفارشات

وزارتِ تعلیم کو چاہیے کہ اسکول اور کالج کی سطح پر کربلائی خواتین کی سیرت کو نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ اساتذہ کو خصوصی تربیتی ورکشاپس کے ذریعے اس موضوع پر آگاہ کیا جائے تاکہ وہ طالبات کو مؤثر طریقے سے یہ سیرت پڑھا سکیں۔ یونیورسٹی کی سطح پر کربلائی سیرت کو بطور case study پڑھایا جائے اور اس پر تحقیقی مقالے لکھوائے جائیں۔ دینی مدارس میں بھی کربلائی خواتین کے کردار کو خصوصی اہمیت دی جائے اور انھیں محض تاریخی واقعات کے طور پر نہیں بلکہ عملی راہنمائی کے ماخذ کے طور پر پڑھایا جائے۔

سماجی سطح پر سفارشات

خواتین تنظیمیں اور سماجی ادارے کربلائی اقدار کو اپنے منشور اور پروگراموں میں شامل کریں۔ مساجد اور امام بارگاہوں میں خواتین کے لیے خصوصی تربیتی حلقے قائم کیے جائیں جہاں کربلائی سیرت کو عملی زندگی سے جوڑ کر بیان کیا جائے۔ ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے کربلائی خواتین کی سیرت کو نوجوان نسل تک پہنچایا جائے۔ حکومتی سطح پر ایسی پالیسیاں بنائی جائیں جو خواتین کی اخلاقی اور سماجی قیادت کو فروغ دیں۔

مزید تحقیق کی تجاویز

زیرِ نظر تحقیق نے کربلائی ماؤں کی سیرت کے بنیادی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے تاہم اس موضوع کی وسعت اور گہرائی کے پیشِ نظر مزید تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ درج ذیل موضوعات پر مستقبل میں تحقیق کی جاسکتی ہے۔

پہلی تجویز یہ ہے کہ پاکستان اور جنوبی ایشیا کے سماجی تناظر میں کربلائی ماؤں کی سیرت کے اطلاق پر ایک مستقل میدانی تحقیق کی جائے جس میں خواتین کے انٹرویوز اور سروے شامل ہوں۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ کربلائی سیرت اور جدید نفسیاتی تھیوریوں کے درمیان تقابلی تحقیق کی جائے تاکہ اسلامی نفسیات کو ایک مستقل علمی شعبے کے طور پر فروغ دیا جاسکے۔ تیسری تجویز یہ ہے کہ تعلیمی نصاب میں کربلائی سیرت کو شامل کرنے کے اثرات کا جائزہ لیا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس سے طالبات کی اخلاقی اور سماجی ترقی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ چوتھی تجویز یہ ہے کہ کربلائی خواتین کے خطبات کا عصری تجزیہ کیا جائے اور انھیں

communication اور leadership کے جدید نظریات کی روشنی میں پرکھا جائے۔ پانچویں تجویز یہ ہے کہ مختلف مسلم ممالک میں کربلائی سیرت کی تعلیم کے طریقہ کار کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تاکہ ایک مشترکہ اور مؤثر تعلیمی ماڈل تیار کیا جا سکے۔

اختتام

یہ تحقیق اس بات کا ثبوت ہے کہ کربلائی ماؤں کی سیرت محض تاریخ کے صفحات میں بند ایک یادگار نہیں بلکہ یہ ایک زندہ، فعال اور ہمیشہ قابلِ عمل راہنمائی ہے جو ہر دور کی خواتین کو ان کے سوالوں کا جواب دیتی ہے۔ حضرت زینبؑ کا وہ جملہ کہ میں نے کربلا میں خوبصورتی کے سوا کچھ نہیں دیکھا آج بھی ہر اس خاتون کے لیے ایک روشن چراغ ہے جو زندگی کی تاریکیوں میں راستہ ڈھونڈ رہی ہے۔

آج جب مسلمان خواتین شناختی بحران، خاندانی انتشار اور سماجی دباؤ کا سامنا کر رہی ہیں تو کربلائی ماؤں کی سیرت انھیں یہ یاد دلاتی ہے کہ حقیقی طاقت باہر سے نہیں بلکہ اندر سے آتی ہے، ایمان سے آتی ہے، علم سے آتی ہے اور اخلاق سے آتی ہے۔ وہ خواتین جنھوں نے چودہ سو سال پہلے صحرائے کربلا میں بے سروسامانی کے عالم میں دنیا کی طاقتور ترین سلطنت کو للکارا، آج بھی ہر مظلوم، ہر پریشان اور ہر بے سہارا خاتون کے ساتھ کھڑی ہیں اور اسے یہ پیغام دے رہی ہیں کہ ہمت مت ہارو، حق پر ڈٹے رہو اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔

کربلائی سیرت کو اپنانا محض ایک مذہبی فریضہ نہیں بلکہ یہ ایک فکری، سماجی اور تہذیبی ضرورت ہے۔ وہ معاشرہ جو اپنی خواتین کو کربلائی اقدار سے آراستہ کر لے وہ نہ صرف اخلاقی طور پر مضبوط ہوگا بلکہ سماجی، علمی اور تہذیبی اعتبار سے بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا۔ اس تحقیق کی یہی اصل پیغام اور خاتمہ ہے کہ کربلا کا سفر ختم نہیں ہوا، یہ سفر ہر اس خاتون کے قدموں میں جاری ہے جو حق کے راستے پر چل رہی ہے۔

Reference

Aghaie, K. S).2004.(The martyrs of Karbala: Shi'i symbols and rituals in modern Iran. University of Washington Press.

Ahmed, L).1992.(Women and gender in Islam: Historical roots of a modern debate. Yale University Press.

Al-Mufid, M).1981.(Kitab al-Irshad: The book of guidance(I. K. Howard, Trans.(.Tahrike Tarsile Quran.

Ayoub, M).1978.(Redemptive suffering in Islam: A study of the devotional

aspects of Ashura in Twelver Shi'ism. Mouton Publishers.

Hussain, S).2005.(Women of Karbala: Ritual performance and symbolic discourses in modern Shi'i Islam. University of Texas Press.

Ibn Tawus, A).1995.(Luhuf: Sighs of sorrow(S. A. Qara'i, Trans.(.Ansariyan Publications.

Khalidi, T).2009.(Images of Muhammad: Narratives of the Prophet in Islam across the centuries. Doubleday.

Mernissi, F).1991.(The veil and the male elite: A feminist interpretation of women's rights in Islam. Addison-Wesley Publishing.

Mutahhari, M).1999.(The epic of Karbala. Islamic Publications International.

Pinault, D).1992.(The Shiites: Ritual and popular piety in a Muslim community. St. Martin's Press.

Qazwini, S. M).2010.(Lady Zaynab: The eminent lady of the Hashimites. Islamic Cultural Center of England.

Shabbar, J).1997.(The heart of Islam: The tragic story of Imam Husayn. Muhammadi Trust.

Shariati, A).1981.(Fatima is Fatima(L. Bakhtiar, Trans.(.The Shariati Foundation.

Aghaie, K. S).2004.(The martyrs of Karbala: Shi'i symbols and rituals in modern Iran. University of Washington Press.

Ahmed, L).1992.(Women and gender in Islam: Historical roots of a modern debate. Yale University Press.

Bowlby, J).1988.(A secure base: Parent-child attachment and healthy human development. Basic Books.

Frankl, V. E).2006.(Man's search for meaning. Beacon Press.

Hussain, S).2005.(Women of Karbala: Ritual performance and symbolic

discourses in modern Shi'i Islam. University of Texas Press.

Ibn Tawus, A).1995.(Luhuf: Sighs of sorrow(S. A. Qara'i, Trans.(.Ansariyan Publications.

Mernissi, F).1991.(The veil and the male elite: A feminist interpretation of women's rights in Islam. Addison-Wesley Publishing.

Mutahhari, M).1999.(The epic of Karbala. Islamic Publications International.

Noddings, N).2003.(Caring: A feminine approach to ethics and moral education(2nd ed.(.University of California Press.

Pargament, K. I).1997.(The psychology of religion and coping: Theory, research, practice. Guilford Press.

Qazwini, S. M).2010.(Lady Zaynab: The eminent lady of the Hashimites. Islamic Cultural Center of England.

Ramadan, T).2004.(Western Muslims and the future of Islam. Oxford University Press.

Seligman, M. E. P).2011.(Flourish: A visionary new understanding of happiness and well-being. Free Press.

Shariati, A).1981.(Fatima is Fatima(L. Bakhtiar, Trans.(.The Shariati Foundation.

Stowasser, B. F).1994.(Women in the Quran: Traditions and interpretation. Oxford University Press.

Tajfel, H Turner, J. C).1986.(The social identity theory of intergroup behavior. In S. Worchel W. G. Austin(Eds※(.Psychology of intergroup relations(pp. 724.(Nelson-Hall.

United Nations).2020.(Women's political participation: Issues, challenges and the path forward. UN Women.

Wadud, A).1999.(Quran and woman: Rereading the sacred text from a

woman's perspective. Oxford University Press.Aghaie, K. S).2004.(The martyrs of Karbala: Shi'i symbols and rituals in modern Iran. University of Washington Press.

Ahmed, L).1992.(Women and gender in Islam: Historical roots of a modern debate. Yale University Press.

Al-Mufid, M).1981.(Kitab al-Irshad: The book of guidance(I. K. Howard, Trans.(.Tahrike Tarsile Quran.

Bandura, A).1997.(Self-efficacy: The exercise of control. W. H. Freeman and Company.

Bowlby, J).1988.(A secure base: Parent-child attachment and healthy human development. Basic Books.

Frankl, V. E).2006.(Man's search for meaning. Beacon Press.

Goleman, D).1995.(Emotional intelligence: Why it can matter more than IQ. Bantam Books.

Hussain, S).2005.(Women of Karbala: Ritual performance and symbolic discourses in modern Shi'i Islam. University of Texas Press.

Ibn Tawus, A).1995.(Luhuf: Sighs of sorrow(S. A. Qara'i, Trans.(.Ansariyan Publications.

Mernissi, F).1991.(The veil and the male elite: A feminist interpretation of women's rights in Islam. Addison-Wesley Publishing.

Mutahhari, M).1999.(The epic of Karbala. Islamic Publications International.

Noddings, N).2003.(Caring: A feminine approach to ethics and moral education(2nd ed.(.University of California Press.

Pargament, K. I).1997.(The psychology of religion and coping: Theory, research, practice. Guilford Press.

Pinault, D).1992.(The Shiites: Ritual and popular piety in a Muslim

community. St. Martin's Press.

Ramadan, T).2004.(Western Muslims and the future of Islam. Oxford University Press.

Seligman, M. E. P).2011.(Flourish: A visionary new understanding of happiness and well-being. Free Press.

Shariati, A).1981.(Fatima is Fatima(L. Bakhtiar, Trans.(.The Shariati Foundation.

Stowasser, B. F).1994.(Women in the Quran: Traditions and interpretation. Oxford University Press.

UNESCO).2019.(Women's leadership in education: Global report. United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization.

United Nations).2020.(Women's political participation: Issues, challenges and the path forward. UN Women.

Wadud, A).1999.(Quran and woman: Rereading the sacred text from a woman's perspective. Oxford University Press.

❑❑❑❑❑

تحریک کربلا میں اصحاب رسول اللہ کا کردار

تحریر: ڈاکٹر سید مشتاق مہدی

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اسلام کے اولین مدافع ہیں۔ انھوں نے اس وقت توحید کی گواہی دی جب زمین پر طرح طرح کے خداؤں کا راج تھا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس وقت تصدیق کی جب سب تکذیب کر رہے تھے۔ انھوں نے اس وقت مالی ایثار کیا جب اسلام پر احتیاج و عسرت کا زمانہ تھا۔ حریم اسلام کے تحفظ کے لیے ہجرتیں کیں، غریب الوطنی کی صعوبتیں اٹھائیں، گھر بار چھوڑا، رشتہ داریاں ترک کیں اور جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ قرآن مجید ان کے لیے اعظم درجوں کی بشارت دیتا ہے اور انھیں کامیاب انسان قرار دیتا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ ہَاجَرُوۡا وَ جٰہَدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِاَمۡوَالِہِمۡ وَ اَنۡفُسِہِمۡ ۙ اَعۡظَمُ دَرَجَۃً عِنۡدَ اللّٰہِ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفَآئِزُوۡنَ۔[1]

''جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے اموال سے اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کیا وہ اللہ کے نزدیک نہایت اعظم درجہ رکھتے ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں''۔

رسول اللہ کے اصحاب باصفا خدا کی زمین پر خدا کے بندے بن کر رہے اور ہر ایک طاغوت کا انکار کرتے رہے۔ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیر قیادت انھوں نے منصفانہ اور عادلانہ انسانی معاشرے کی بنیاد ڈالی۔ جس میں ہر کام رضائے ربّ کے لیے انجام دیا جاتا، ہر آن نفسانی خواہشات کی مخالفت کی جاتی۔ اخوت، مؤاخات، مؤانست، انصاف، مساوات، خیر خواہی، ہمدردی، دلگیری اور عاجزی اس نبوی معاشرے کے امتیازات تھے۔

سرکار سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے لے کر 61ھ تک یکے بعد دیگرے وہ ہستیاں اٹھتی چلی گئیں جن کی تربیت معلم قرآن نے قرآنی اصولوں پر کی تھی اور پھر اسلامی سماج پر بتدریج بنی طلقاء کا اقتدار بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ معاملہ بیعت یزید بن معاویہ تک آ پہنچا۔ اب نواسہ رسولؐ دلبند بتول امام حسین علیہ السلام نے مقتدر قوتوں کو واضح پیغام دیا:

مثلی لا یبایع مثلہ۔۔۔۔

مجھ جیسا اس (یزید) جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا۔

---

[1] سورہ توبہ: ۲۰

اور اپنے تین نکاتی پروگرام کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

1: **انما خرجت لطلب الاصلاح فی امت جدی** * میں اپنے جد پاک کی امت کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں۔

2: **اریدان امر بالمعروف وانھی عن المنکر** * میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کروں۔

3: **واسیر بسیرۃ جدی وابی علی بن ابی طالب** * ان امور کی انجام دہی میں اپنے نانا اور بابا علی بن ابی طالب کی سیرت پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔

آج ہم ان بزرگ صحابہ کرام کا ذکر کریں گے جنھوں نے اصلاح امت کے لیے امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دیا۔ اگر چہ کہ وہ سن رسیدگی اور کہولت کا شکار ہو چکے تھے مگر اہداف اسلامی کے حصول کے لیے جواں جذبہ فداکاری رکھتے تھے۔ پروگرام حسینی کے لیے کربلا میں جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کی توصیف جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان الفاظ میں فرمائی۔ امام عالی مقام علیہ السلام کہتے ہیں کہ میرے نانا پاک ص نے مجھ سے فرمایا:

''اے میرے فرزند عنقریب تجھے عراق کی طرف لے جایا جائے گا۔ یہ وہ زمین ہے جہاں نبیوں اور وصیوں کی ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔ اسے عمورا بھی کہا جاتا ہے۔ وہاں تو شہید کیا جائے گا اور تیرے ہمراہ ایک گروہ بھی شہید کیا جائے گا جو ہتھیاروں کی تکالیف کو خاطر میں نہ لائے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت پڑھی۔

يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ[1]

اے آگ! سلامتی کے ساتھ ابراہیم پر ٹھنڈی ہو جا۔

پھر فرمایا: اسی طرح آتش جنگ تمھارے اور تمھارے ہمراہیوں کے لیے باعث سلامتی ہوگی۔ (سعادۃ الدارین)

آیئے ان پاکباز ہستیوں کا حیات آفریں تذکرہ مختصراً کرتے ہیں۔

1۔ مسلم بن کثیر اعرج:

عسقلانی کے بیان سے اِن کا صحابی ہونا واضح ہوتا ہے۔۔۔(سعادۃ الدارین)

جنگ جمل میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف سے شرکت کی اور ایک تیر آپ کی ٹانگ میں لگا۔ جس کا اثر زندگی بھر رہا اور لنگڑا کر چلتے تھے۔ سورۃ فتح میں ارشاد خداوندی ہے:

لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰى حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْاَعْرَجِ حَرَجٌ وَّ لَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا

---

[1] سورہ انبیاء: ۶۹

''(جہاد میں شرکت نہ کرنے میں) اندھے پر کوئی حرج نہیں اور نہ ہی لنگڑے پر کوئی مؤاخذہ ہے اور نہ ہی بیمار پر کوئی حرج ہے، جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اللہ اسے ایسی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور جو منہ موڑ لے گا اللہ اسے شدید دردناک عذاب دے گا''۔

اس خدائی فرمان کے مطابق اگر مسلم بن کثیر جہاد کربلا میں حصہ نہ لیتے تو ان کے لیے کوئی مؤاخذہ نہ تھا لیکن شوق شہادت اور کامل جذبہ ایثار لے کر آپ وارد کربلا ہوئے اور صبح عاشور حملۂ اولی میں شہادت کی سعادت پائی۔

2۔ یزید بن مغفل عامری جعفی:

ابن حجر عسقلانی نے انھیں ''الاصابہ'' میں صحابی رسول اللہ شمار کیا ہے۔ کوفہ کے رہائشی تھے اور امیر المومنین علی علیہ السلام کے فداکار ساتھیوں میں سے تھے۔ جنگ صفین میں شریک ہوئے۔

خلافت امیر المومنین علیہ السلام کے زمانے میں جب حریث (یا خریث) خارجی نے اہواز میں خروج کیا تو علی علیہ السلام نے اس کی سرکوبی کے لیے ایک لشکر معقل بن قیس کی سرکردگی میں روانہ کیا۔ یزید بن مغفل اس لشکر میں میمنہ پر سردار مقرر ہوئے۔ (ابصار العین، شہدائے کربلا)

آپ کوفہ سے مکہ پہنچے اور قافلہ حسینی سے ملحق ہو گئے۔ روز عاشور زبردست قتال کیا۔ ایسی جنگ کی کہ کم ہی کسی سے دیکھی گئی ہو گی۔ لشکر شام کے بہت سے لوگوں کو جہنم رسید کیا اور رتبہ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

''ابصار العین فی انصار الحسین'' میں لکھا ہے: ''**کان احد الشجعان من الشیعة و الشعراء المجیدین**'' آپ بہادر شیعوں میں سے اور جید شعراء میں سے تھے۔

3۔ جندب بن حجیر (بروزن زبیر) الکندی الخولانی:

صاحب ''ذخیرۃ الدارین'' نے انھیں اصحاب پیغمبر اسلام میں شمار کیا ہے۔ علی علیہ السلام کی حمایت میں جنگ صفین میں نہ صرف شریک ہوئے بلکہ قبیلہ کندہ اور ازد کے رسالوں کے افسر مقرر ہوئے۔ کوفہ سے روانہ ہو کر منزل حاجز پر خدمت امام عالی مقام علیہ السلام میں حاضر ہوئے۔ یوم عاشور نصرت امام کا حق ادا کیا اور درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ زیارت شہدأ میں ان پر اس طرح سلام آیا ہے: السلام علی جندب بن حجر الخولانی (شہدائے کربلا، سعادۃ الدارین)

4۔ حجاج بن زید السعدی:

''الاصابہ'' میں ابن حجر عسقلانی نے صحابی رسول لکھا ہے۔ آپ بصرہ کے رہنے والے تھے اور قبیلۂ بنی سعد کی شاخ بنی تمیم

میں سے تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے بصرہ کے ایک بزرگ یزید بن مسعود نہشلی یا مسعود بن عمرو ازدی کو خط لکھا۔ اس خط کا جواب حجاج بن زید السعدی لے کر خدمت امام میں حاضر ہوئے اور پھر آپ علیہ السلام کے ہمرکاب رہے، یہاں تک کہ عاشورہ کے دن ثابت قدمی اور بہادری سے دشمنان امام سے لڑے اور شہادت پائی۔ زیارت شہداء میں ان پر سلام بایں الفاظ آیا ہے:

"السلام علی الحجاج بن زید السعدی"

5۔ عبدالرحمٰن بن عبدرب الانصاری:

یہ انصاری تھے اور بنی خزرج سے تھے۔ "الاصابہ" میں ابن حجر عسقلانی نے اور "اسد الغابہ" میں ابن اثیر جزری نے اس بزرگ صحابی کے حالات درج کیے ہیں۔ آپ نے حضرت علی علیہ السلام سے تعلیم قرآن حاصل کی۔ حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام نے اپنے دور خلافت میں جب مقام رحبہ پر حدیث غدیر کی گواہی طلب کی تو دیگر صحابہ کرام جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں ابو ایوب انصاری، ابوعمر بن ابوعمرو بن محصن، ابوزینب، سہیل بن حنیف، خزیمہ بن ثابت، عبداللہ بن ثابت، حبشی بن جنادہ سلولی، عبید بن عازب، نعمان عجلان انصاری، عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری کے ساتھ مل کر گواہی دی کہ ہم نے اپنے کانوں سے مقام غدیر پر رسول اللہ ﷺ سے سنا، وہ فرما رہے تھے:

"ان اللّٰہ ولی و انا ولی المومنین فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ اللھم وال من والاہ و عاد من عادہ و احب من احبہ و ابغض من ابغضہ و اعن من اعانہ۔" (الاصابہ فی تمییز الصحابہ، ابصار العین فی انصار الحسین)

علامہ ابن اثیر جزری نے کتاب "اسد الغابہ" میں اس حدیث کو درج بالا تمام صحابہ کے حالات کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ عبدالرحمٰن مکہ ہی سے نواسہ رسول کے ساتھ ہو گئے تھے حتیٰ کہ احیائے اسلام کی خاطر میدان کربلا میں لڑتے ہوئے حملہ اولی میں منصب شہادت پر فائز ہو گئے۔ (شہدائے کربلا، سعادۃ الدارین فی مقتل الحسین)

6۔ مجمع بن زیاد الجہنی:

"الاستیعاب" میں ہے کہ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ بدر و احد میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ چشمہ ہائے جہنیہ پر مقیم تھے اور یہیں سے شریک قافلۂ شہادت ہوئے۔ دس محرم الحرام کو بہت سے ناریوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد شہادت پائی اور فائز المرام قرار پائے۔ (شہدائے کربلا، سعادۃ الدارین)

7۔ زاہر بن عمرو (الاسود) اسلمی:

آپ ان اصحاب رسول اللہ میں سے ہیں جن کو بیعت رضوان کا شرف حاصل ہوا۔ صلح حدیبیہ کے بعد جنگ خیبر میں شرکت

کی۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ان سے حدیث لی ہے۔(الاصابہ فی تمیز الصحابہ)

60ھ میں فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد امام علیہ السلام کے قافلے سے آملے اور عاشورہ کے دن حملہ اولی میں درجہ شہادت پایا۔ (شہدائے کربلا، علامہ سید علی نقی)

شیخ طوسی نے لکھا ہے کہ زاہر کے پوتے محمد بن سنان نے حضرت امام علی رضا اور امام محمد تقی علیہما السلام سے احادیث روایت کی ہیں۔ (ابصار العین فی انصار الحسین۔۔۔شیخ محمد بن طاہر سماوی نجفی)

8۔ شبیب بن عبداللہ نہشلی:

یہ حارث بن سریع ہمدانی کے غلام تھے۔ نسابہ کلبی وغیرہ کا بیان ہے کہ واقعہ کربلا میں حارث بہت سن رسیدہ تھے اور انھوں نے صحبت رسول اللہ کا شرف پایا تھا۔ آپ دور خلافت امیر المومنین علی علیہ السلام میں جنگ جمل، جنگ نہروان اور جنگ صفین میں فدا کارانہ جوہر دکھا چکے تھے۔ اپنے شہر کوفہ سے سیف بن حارث اور مالک بن سریع کے ہمراہ نکلے اور قافلہ شہادت میں شامل ہوئے۔ بقائے دین کی خاطر یوم عاشور راہ خدا میں مردانہ وار لڑتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ زیارتِ شہدا میں ان پر سلام کہا گیا ہے۔(شہدائے کربلا، سعادۃ الدارین)

9۔ عمار (عمارہ) بن ابی سلامہ دالانی:

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: عمار بن ابی سلامہ بن عبداللہ بن عمران بن راس بن دالان ہمدانی نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے زمانے کو درک کیا اور علی بن ابی طالب کے ساتھ جمل، صفین اور نہروان کی جنگوں میں شرکت کی اور کربلا میں حسین بن علی علیہما السلام کے ساتھ شہید ہوئے۔ (شہدائے کربلا، علامہ سید علی نقی)

10۔ انس بن الحارث (حرث) الکاہلی:

انس قبیلہ بنی اسد کی شاخ بنو کاہل سے تھے اور کوفہ کے رہنے والے تھے۔ زیارت شہداء میں آپ پر سلام کہا گیا ہے۔

''اسد الغابہ'' میں ابن اثیر جزری نے لکھا ہے:

''ابن مندہ نے ان کو صحابہ میں شمار کیا ہے۔ ابن مندہ کی ابوعمر نے اور ابو احمد عسکری نے موافقت کی ہے۔ ان دونوں نے کہا ہے کہ ان کا صحابی ہونا ثابت ہے۔''

ابن حجر عسقلانی نے ''الاصابہ'' میں لکھا:

''ان کی حدیث میں نظر ہے۔۔۔ادھر بغوی، ابن السکن، ابن شاہین دعولی، ابن زبر، باوردی، ابن مندہ اور ابونعیم وغیرہ نے انھیں صحابہ میں ذکر کیا ہے''۔

ابن عبدالبر قرطبی نے انھیں اصحاب رسول میں درج کیا ہے۔ ابن عساکر نے صحابہ میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے:

''کان انس بن الحرث بن بنیہ الکاہلی صحابیا کبیرا ممن رأی النبی وسمع حدیثہ'' یعنی انس بن حارث بزرگ صحابی تھے، جنھوں نے نبی اکرم کو دیکھا اور ان سے براہ راست حدیث سنی۔ (تاریخ ابن عساکر جلد 2)

اصابہ اور اسد الغابہ میں درج ہے کہ انس کہتے ہیں کہ میں رسول خدا کی بارگاہ میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ امام حسینؑ آپ کی گود میں ہیں:

''سمعت رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم یقول ان ابنی ھذا یقتل بارض یقال لھا کربلا فمن شھد ذالک منکم فلینصرہ''

میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا کہ میرا یہ فرزند (حسین) زمین کربلا پر قتل ہوگا۔ تم سے جو شخص اس کو اس حال میں پائے، اس کی ضرور نصرت کرے۔ (ابصار العین، شہدائے کربلا)

علامہ مامقانی کے مطابق آپ رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بدر وحنین میں شرکت کر چکے تھے۔ کربلا میں آپ بہت سن رسیدہ تھے۔ میدان میں جانے سے پہلے آپ نے عمامہ اتارا اور خمیدہ کمر کو اس سے اچھی طرح باندھا۔ اپنی بھوؤں کو جو آنکھوں پر لٹک آئیں تھیں اونچا کر کے ماتھے پر رومال سے باندھ لیا۔ امام علیہ السلام نے اپنے نانا پاک کے ضعیف العمر صحابی کو جہاد کے لیے اس طرح تیار ہوتے دیکھا تو رو پڑے اور یہ دعا دی: "شکر اللہ لک یا شیخ" اے شیخ بزرگ! خدا تیری اس سعی کو مشکور فرمائے۔

آپ فوج اشقیاء پر حملے کر رہے تھے اور یہ رجز پڑھ رہے تھے۔

ال علی شیعۃ الرحمٰن

و ال حرب شیعۃ الشیطان

اس شیر بیشۂ مرد شجاع نے اٹھارہ یزیدیوں کو جہنم واصل کیا اور شہادت پائی۔

11۔ حرث بن نبہانی:

آپ سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے غلام تھے اور بڑے بہادر شہسوار تھے۔ جناب حمزہ کی شہادت کے بعد حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی خدمت میں رہے۔ پھر سبط اکبر حضرت امام حسن علیہ السلام کی صحبت سے فیضیاب ہوئے اور شہادت

امام حسن کے بعد امام حسین علیہ السلام کے دامن سے منسلک ہو گئے، حتیٰ کہ مدینہ سے کربلا تک ہمسفر رہے اور بالآخر روز عاشور پہلے حملے میں شہید ہو کر ہمیشہ ہمیش کے لیے فردوس مکانی ہو گئے۔ (ابصار العین)

12۔ مسلم بن عوسجہ اسدی:

آپ قبیلۂ بنی اسد کے بزرگ، مجاہد، مبارز، قائم اللیل، صائم النہار اور قاری قرآن تھے۔ 24ھ میں جب آذربائیجان کی فتح کے لیے حضرت حذیفہ یمانی رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکر روانہ ہوا تو حضرت مسلم بن عوسجہ اس لشکر میں شامل تھے اور اس جنگ میں انھوں نے چھ مشرکوں کو قتل کیا۔

''طبقات'' میں ابن سعد نے انھیں صحابی لکھا ہے اور محدث شعبی نے ان سے روایت حدیث کی ہے۔

امیر المومنین علی علیہ السلام کی حمایت میں تینوں جنگوں جمل، نہروان اور صفین میں شریک ہوئے۔ کوفہ میں سکونت پذیر تھے۔ جب سفیر حسینی حضرت مسلم بن عقیل وارد کوفہ ہوئے تو مسلم بن عوسجہ اور حبیب بن مظاہر اسدی ان کے معتمدین خاص میں شامل تھے۔ شہادت حضرت مسلم بن عقیل کے بعد یہ دونوں بزرگوار روپوش ہو گئے۔ پھر مسلم بن عوسجہ مع اپنے اہل و عیال کے بمشکل تمام ریاستی رکاوٹیں اور ناکہ بندیاں عبور کرتے ہوئے، کربلا میں ساتویں یا آٹھویں محرم کو پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ شب عاشور جب امام علیہ السلام نے اپنے انصار سے کہا کہ یہ لوگ صرف میری جان کے درپے ہیں لہٰذا تم رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، جہاں جائے امن پاؤ چلے جاؤ، تو انصاران حسینی میں سب سے پہلے مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے اور ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے کہا:

''اے فرزند رسولؐ! اگر آج ہم اس حال میں آپ کو تنہا چھوڑ کر چلے جائیں تو کل بروز محشر آپ کے جد پاک کا سامنا کیسے کریں گے۔ یہ نیزہ جو میرے ہاتھ میں ہے اس سے میں دشمن کے سینے چھلنی کرتا رہوں گا یہاں تک کہ یہ ٹوٹ جائے۔ یہ تلوار اس سے میں دشمن پر وار اس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک اس کے قبضے پر میرا ہاتھ ہے۔ تلوار کے بعد میں ان پر پتھروں کی بارش کروں گا۔ یہ تو ایک بار قتل ہونا ہے اگر مجھے قتل کیا جائے، قتل کرنے کے بعد جلا دیا جائے اور میری راکھ کو فضا میں بکھیر دیا جائے۔ پھر زندہ کیا جائے اور یہ عمل میرے ساتھ ستر بار دہرایا جائے تو پھر بھی میں آپ پر فدا ہونا ہی پسند کروں گا۔''

صبح عاشور کو امام علیہ السلام نے اپنے مختصر لشکر کی تنظیم کی تو مسلم بن عوسجہ کو میسرہ پر زہیر بن قین کی زیر کمان تعینات کیا۔ مسلم جب میدان میں اترے تو زبردست قتال کیا اور اس ضعیف العمر صحابی رسول کی تلوار نے پچاس یزیدیوں کو جہنم روانہ کیا۔ اب لشکر یزید نے مل کر چاروں طرف سے سید الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے بوڑھے صحابی پر حملہ کر دیا۔ جب مسلم گھوڑے سے گرے، تو امام عالی مقام علیہ السلام حبیب ابن مظاہر کی ہمراہی میں زخمی مسلم کے پاس پہنچے اور کہا:

اے مسلم! اللہ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ پھر آپ علیہ السلام نے سورۃ احزاب کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوا تَبْدِيلًا۔

مومن مردوں میں سے کچھ ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا، ان میں سے کچھ نے اپنی ذمہ داری کو پورا کر دیا ہے اور ان میں سے کچھ ابھی انتظار گاہ میں حالت انتظار میں ہیں اور وہ ذرا بھر نہیں بدلے۔

امام علیہ السلام کے بعد حبیب بن مظاہر اسدی اپنے دیرینہ ساتھی مسلم سے یوں ہمکلام ہوئے:

''اے مسلم! اگر چہ آپ کی جدائی ہم پر شاق ہے مگر آپ کو جنت کی بشارت ہو۔ اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ میں بھی جلد آپ کے پیچھے آ رہا ہوں تو آپ سے کہتا کہ وصیت کیجئے۔ اب سراپا ایثار مسلم نے اپنا کمزور زخمی ہاتھ اٹھایا اور فرزند رسولؐ امام حسین علیہ السلام کی جانب اشارہ کیا اور کہا: اوصیک بھذا۔۔۔ تمھیں اس کے بارے میں وصیت کرتا ہوں۔

حبیب نے جواب دیا: رب کعبہ کی قسم ویسا ہو گا جیسا کہ آپ چاہتے ہیں۔

پھر مسلم یعنی آل عبا کا جانثار ابدیت کے گھر کو سدھار گیا۔

13۔ حبیب ابن مظاہر اسدی:

ابن کلبی کی روایت کے مطابق آپ صحابی تھے اور رسول اللہ کی زیارت کی تھی۔ (شہدائے کربلا۔۔ علامہ سید علی نقی)

ابن حجر عسقلانی نے انھیں صحابہ رسول میں شمار کیا ہے۔ (الاصابہ فی تمیز الصحابہ)

آپ کے والد کا نام مظاہر اور مظہر بروزن ''محمد'' وارد ہوا ہے۔ آپ نے جو اشعار میدان کربلا میں بطور رجز پڑھے ان میں اپنے والد کا نام ''مظہر'' بتایا ہے۔

انا حبیب و ابی مظھر

فارس ھیجاء و حرب تسعر

وفات پیغمبر اسلام کے بعد آپ امیر المومنین علی اور حسنین کریمین علیہم السلام سے وابستہ رہے۔ جنگ جمل، نہروان اور صفین میں حضرت علی علیہ السلام کے فدا کار ساتھی رہے۔ آپ کو امیر المومنین علیہ السلام سے شرف تلمذ بھی حاصل رہا۔ علی علیہ السلام نے حبیب، میثم تمار اور رشید ہجری کو علم البلایا والمنایا کی تعلیم دی اور مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات سے آگاہ کر دیا تھا۔ رجال کشی میں ہے کہ ایک دن جناب میثم تمار اور حبیب اپنے اپنے گھوڑوں پر مخالف سمتوں سے آ رہے تھے کہ ملاقات ہو گئی، ایک

دوسرے کے اتنے قریب آئے کہ گھوڑوں کی گردنیں باہم مل گئیں۔

حبیب نے کہا: میں ایک عمر رسیدہ بزرگ کو دیکھ رہا ہوں جس کے سر کے اگلے حصے کے بال نہیں ہیں، پیٹ ذرا بڑھا ہوا ہے، دار الرزق کے پاس خربوزے بیچتا ہے، اسے محبت اہل بیتؑ کے جرم میں سولی پر لٹکا دیا گیا ہے۔ یہ سن کر میثم تمار نے کہا: میں بھی ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کا رنگ سرخ وسفید ہے اور سر پر دو گیسو ہیں، وہ فرزند دختر رسولؐ کی نصرت کے لیے نکلے گا اور قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے سر کو کوفہ کے بازاروں میں پھرایا جائے گا، اس گفتگو کے بعد دونوں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد جناب رشید ہجری وہاں آئے تو لوگوں نے میثم اور حبیب کے مابین مکالمے کے بارے میں انھیں بتایا تو رشید ہجری نے کہا: خدا میثم پر رحم فرمائے۔ وہ یہ بتانا بھول گئے ہیں کہ جو شخص دختر رسول کے ناصر و مددگار کا سر لے کر دربار میں جائے گا اس کو انعام میں ایک سو درہم زیادہ ملیں گے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ میثم تمار کو کوفہ میں عمرو بن حریث کے دروازے پر سولی چڑھا دیا گیا اور جناب حبیب کے قاتل نے ان کا سر گھوڑے کی گردن میں لٹکایا ہوا تھا اور کوفہ کی گلیوں میں پھرانے کے بعد اس نے سر کو ابن زیاد ملعون کے سامنے پیش کیا اور دوسرے خطا کاروں کی نسبت سو درہم زیادہ انعام پایا۔ (ابصار العین، سعادۃ الدارین)

جب مسلم بن عقیل سفارت حسینی کے فرائض انجام دے رہے تھے تو حبیب بن مظاہر اور مسلم بن عوسجہ ان کے خاص معتمدین میں سے تھے اور لوگوں سے امام علیہ السلام کی بیعت لیا کرتے تھے۔ شہادت مسلم بن عقیل کے بعد حبیب نے راستے میں ناکوں کو توڑتے ہوئے رکاوٹوں کو عبور کیا اور سات یا آٹھ محرم الحرام کو کربلا پہنچے۔

شب عاشور اور حبیب:

شب عاشور ایک بار امام حسین علیہ السلام سے جناب زینب عالیہ سلام اللہ علیہا عرض پرداز ہوئیں کہ کیا آپ نے اصحاب کی وفاداری کو جانچ لیا ہے؟ جب حبیب بن مظاہر اسدی کو اس امر کی اطلاع ہوئی تو حبیب نے تمام اصحاب حسینی کو جمع کیا۔ سب ہتھیار بند ہو کر درخیام پر پہنچے۔ اپنے سروں سے عمامے اتار کر اور گردنیں جھکا کر جناب شریکۃ الحسین اور دیگر مخدرات عصمت کو نصرت و مدد کا یقین دلایا تو جناب شریکۃ الحسین سیدہ زینب سلام اللہ علیہا نے فرمایا:

"ایھا الطیبون حاموا عن الفاطمیات"۔

روز عاشور اور حبیب:

روز عاشور حبیب کو لشکر کے میمنہ پر سردار مقرر کیا گیا۔ حبیب میدان کارزار میں اترے تو پینسٹھ افراد کو تہہ تیغ کیا۔ ایک تمیمی نے چھپ کر تیر مارا جس سے آپ زمین پر آ رہے۔ تب حصین بن نمیر بدبخت نے سر پر تلوار کا وار کیا اور تمیمی ملعون نے سر اور تن کے مابین جدائی ڈال دی۔ حصین بن نمیر نے آپ کا سر گھوڑے کی گردن سے باندھا اور پورے لشکر میں پھرتا رہا۔ پھر سر کو تمیمی کے

حوالے کر دیا جس نے کوفہ کے بازاروں میں پھرانے کے بعد ابن زیاد کے سامنے پیش کیا اور اس نے دوسروں کی نسبت انعام میں سو درہم زیادہ پائے۔

وقت آخر جب امام علیہ السلام حبیب کے پاس پہنچے تو فرمایا:

”احتسب نفسی و حماۃ اصحابی“

یعنی میں اپنے نفس اور اپنے اصحاب کی جزا کا اللہ سے امیدوار ہوں۔

کئی بار کہا: انا للہ وانا الیہ راجعون اور یہ بھی فرمایا:

”للہ درک یا حبیب کنت فاضلا

تختم القرآن فی لیلۃ واحدۃ“

□□□□□



کربلا اور امام حسینؑ
(قیام حسینی کے اہداف و مقاصد اور موجودہ حالات)

مفتی محمد ہاشم سندھی

مؤسس: تحقیقاتی ادارہ برائے مہدویت (امام مہدی کمپلیکس) سندھ

اگر ہم تعصب کی عینک اتار کر تاریخ بشریت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ تاریخ بشریت میں بہت سے تلخ اور شیرین حوادث وقوع پذیر ہوئے۔ تاریخ اسلام میں بالخصوص، اپنے علل و اسباب، اہداف، مقاصد، نتائج اور اثرات کے حوالے سے، جو شہرت واقعہ کربلاء کو نصیب ہوئی ہے وہ شائد ہی کسی اور واقعہ کو نصیب ہوئی ہو، کیونکہ بظاہر تو یہ جنگ یا واقعہ چند دنوں پر مشتمل ہے مگر اس کے اثرات آج تک تاریخ بشریت میں ایسے ہی رقم ہیں جیسے کہ یہ واقعہ کل ہی وقوع پذیر ہوا ہو۔ جیسا کہ ابوریحان البیرونی کہتے ہیں کہ ایسے سانحے کی نظیر، اسلام تو بجائے خود کسی اور امت میں بھی نہیں ملتی۔[۱]

قیام حسینی پر آکابرین اہل سنت کا خراج عقیدت:

ڈاکٹر طٰہٰ حسین (جامعہ قاہرہ، مصر):

(امام) حسینؑ کا بیعت نہ کرنا ہٹ دھرمی اور ضد کی وجہ سے نہیں تھا وہ جانتے تھے کہ اگر یزید کی بیعت کر لیتے تو اپنے وجدان سے خیانت کا ارتکاب کرتے اور دین کی مخالفت کرتے کیوں کہ یزید کی بیعت ان کی نظر میں گناہ تھا امام حسینؑ حق کے مقابلے میں چشم پوشی کو قطعاً پسند نہیں فرماتے تھے آپ تمام امور اسلامی میں انتہائی زیرک اور مدبرانہ فکر رکھتے تھے۔[۲]

۱۔ آثار الباقیہ، ابوریحان البیرونی، ترجمہ، ص 524

۲۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین، علی و نبوہ، دار المعارف، ص 239

عمر بن عبداللہ فروخ (لبنان):

عمر بن عبداللہ فروخ (لبنان سے تعلق رکھنے والے اہل سنت ادیب ومفکر) کہتے ہیں: ظلم کے بارے میں سکوت کرنا کسی صورت بھی جائز نہیں ہے اور آج کے مسلمانوں کے لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے درمیان ایک حسینی قیام کرے اور ہمیں سیدھے راستے میں حق کے دفاع کرنے کی رہنمائی فرمائے۔ [1]

ڈاکٹر طاہر القادری (سربراہ منہاج القرآن):

شہادت حسین سیرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہی ایک باب ہے امت کو جو فیض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے ملتا ہے وہی فیض امام حسینؑ کی سیرت سے ملتا ہے ضروری ہے اس بات کو سمجھا جائے کہ ذکر امام حسینؑ کیوں ضروری ہے اگر ذکر حسینؑ ضروری نہیں اور شہادت حسینؑ کا تذکرہ اہل بیتؑ ضروری نہیں تو آقا کی امت میں کسی کا ذکر ضروری نہیں کیوں کہ ذکر حسینؑ حقیقت میں خود ذکر مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ [2]

قیام حسین ابن علیؑ کے اہداف ومقاصد:

امام حسینؑ کی مختلف مقامات پر ہونے والی گفتگو کہ جس میں امام نے اپنے قیام کے مقاصد کو بیان کیا ہے۔امام حسینؑ نے جب آخری ایام میں حج بیت اللہ کے لیے مکہ تشریف لے گئے اور وہاں پر بزرگان اور عمائدین اسلامی کے سامنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا کہ جس میں علماء اور اسلامی ممالک کے رہنماوں کی سنگین ذمہ داریوں، حفظ اصول دین، امویوں کے مظالم اور ان کے سامنے خاموشی اور اس کے نتائج پر اپنے تحفظات کا سخت الفاظ میں اظہار کیا۔امام کے اس کلام سے مندرجہ ذیل اہداف واضح ہوتے ہیں:

1۔خالص اسلامی تعلیمات ومظاہر کا احیاء۔

2۔لوگوں کی حالت میں اصلاح وبہبود۔

3۔بنی امیہ کے ظالمین سے مقابلہ تا کہ مظلومین کو امان مل سکے۔

4۔احکامات خداوندی پر عمل درآمد کروانے کے لیے مناسب حالات اور امکانات کی فراہمی۔

پھر جب امام حسینؑ مدینہ سے خارج ہونے لگے تو اپنے بھائی جناب محمد ابن حنفیہ کے نام اپنی وصیت لکھی اور اس میں اپنے اقدام کی وضاحت کچھ یوں فرمائی:

---

[1] ۔فروخ، تجدید فی المسلمین فی الاسلام دار الکتاب العربی، ص152

[2] ۔تحریک منہاج القرآن ویب سائٹ، www.minhag.org

اِنّی لَمْ اَخْرُجْ اَشِراً وَ لا بَطِراً و لا مُفْسِداً وَ لا ظالِماً، وَ اِنَّما خَرَجْتُ لِطَلَبِ الاِصلاحِ فِی اُمه جَدّی محمد (صلی الله علیه و آله و سلم) اُریدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْروفِ و اَنْهی عَنِ المُنْکَرِ و اَسیرَ بِسیره جَدِّی محمد (صلی الله علیه و آله و سلم) و اَبی عَلیِّ بنِ اَبی طالِب (علیه السلام)۔ [۱]

ترجمہ: میں کسی قسم کا فساد پھیلانے یا غرور وتکبر کا اظہار کرنے یا سلطنت حاصل کرنے یا ظلم وستم کے لیے نہیں نکل رہا بلکہ اپنے جد نامدار کی امت کی اصلاح کے لیے نکل رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نیکی کا حکم دوں اور برائی سے روکوں اور اپنے جد بزرگوار اور پدر عالی وقار کی سیرت پر چلوں۔

ایک اور جگہ پر فرماتے ہیں:

اللهم انی احب المعروف و اکره المنکر۔ [۲]

اے خدا میں معروف (نیکی) سے محبت اور اشتیاق رکھتا ہوں اور منکر (برائی) سے متنفر ہوں۔

امام حسین کے اس تحریر سے مندرجہ ذیل اہم نکات کا استخراج کیا جاسکتا ہے:

1۔ امت محمدیہ کی اصلاح طلبی۔

2۔ امر بالمعروف۔

3۔ نہی عن المنکر۔

4۔ سیرت رسولؐ امین اور امیر المومنینؑ پر عمل۔

5۔ فروعات دین کا اہتمام۔

شیعہ تاریخی مصادر میں علمی تحریف:

اہل سنت ریسرچ اسکالر شعیب مزنی لکھتے ہیں: محمد ابن حنفیہ کے نام لکھا گیا وصیت نامہ وہی معتبر ہوگا، جسے سب سے پہلے ابن اعثم کوفی نے نقل کیا۔ معروف مقتل نگار خوارزمی نے بھی اس وصیت نامہ میں ''وسیرۃ الخلفاء الراشدین'' کے الفاظ ابن اعثم الکوفی سے نقل کیے ہیں، مگر ابن اعثم کوفی اور خوارزمی کے بعد منظر عام پر آنے والے جن ثانوی شیعہ مصادر میں سے ''وسیرۃ الخلفاء الراشدین'' کے الفاظ کو خوارزمی سے نقل کرتے ہوئے حذف کیا گیا ہے، ان میں محمد ابن ابی طالب موسوی الحائری کی کتاب زینۃ المجالس اور ملا باقر مجلسی کی کتاب بحار الانوار سرفہرست ہیں۔ اس وصیت نامہ میں ''**و آسیرَ بِسیرۃ جَدِّی محمد و سیرۃ**

---

[۱] ۔ ابن اعثم کوفی، الفتوح، ج5، ص21، خوارزمی، مقتل الحسین، ج1، ص273

[۲] ۔ ابن اعثم، ج5، ص19، خوارزمی، مقتل الحسین، ج1، ص270

آبی عَلِیّ بنِ آبِی طالِب وسیرۃ الخلفاء الراشدین'' کے الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ حسین ابن علیؑ حکومت اسلامی کے احیا کے باب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اپنے والد علی ابن ابی طالب کو مستقل اسوہ قرار دیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے علی ابن ابی طالب کا تذکرہ خلفا راشدین کے ذیل میں کرنے کے بجائے مستقل عملی نمونہ کی حیثیت میں علیحدہ علیحدہ طور پر کیا ہے، جس سے حسین ابن علیؑ کے عمیق تدبر اور ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ [1]

پھر جب امام حسین نے اہل بصرہ کے نام جو خط لکھا:

انا ادعو کم الی کتاب اللہ و سنہ نبیہ فان السنہ قد امیتت و ان البدعہ قد احییت۔ [2]

میں تم لوگوں کو کتاب خدا اور سنت نبوی کی طرف بلاتا ہوں۔ بے شک سنت نبوی کو مٹایا جا چکا ہے اور بدعات کو زندہ کیا جا رہا ہے۔

عبداللہ ابن مطیع کے جواب میں فرماتے ہیں:

ان اهل الکوفه کتبوا الی یسالوننی ان اقدم علیهم لما رجوا من احیاء معالم الحق و اماته البدع۔ [3]

کوفیوں نے میری طرف خط لکھا اور مجھ سے یہ چاہا کہ میں ان کے پاس جاوں کیونکہ ان کو امید ہے کہ میرے توسط سے حق زندہ اور بدعات نیست و نابود ہو جائیں گی۔

بصرہ کے شیعوں کے نام خط میں ارشاد فرماتے ہیں کہ

فانی ادعو کم الی احیاء معالم الحق و اماته البدع۔ [4]

میں تم لوگوں کو حق کی تعلیمات کو زندہ کرنے اور باطل کو مٹانے کے لیے دعوت دیتا ہوں۔

امام کے ان خطوط سے مندرجہ ذیل اہداف واضح ہوتے ہیں:

1۔ کتاب و سنت پر عمل کرنے کی دعوت۔

---

[1]۔ انکار سے استعارے تک، ص 257، مطبوعہ: عکس پبلی کیشن، لاہور، 2026ء

[2]۔ طبری، ایضا، ج 4، ص 266، احمد بن یحییٰ بن جابر البلاذری، انساب الاشراف، تحقیق: سہیل زکّار و ریاض زرکلی، اول، بیروت، دار الفکر، 1417ھ، ج 2، ص 335

[3]۔ ابوحنیفہ احمد بن داود الدینوری، الاخبار الطوال، تحقیق: عبدالمنعم عامر، چ اول، قاہرہ، دار احیاء الکتب العربیۃ، 1960م، ص 246

[4]۔ ابوحنیفہ احمد بن داود الدینوری، الاخبار الطوال، تحقیق: عبدالمنعم عامر، چ اول، قاہرہ، دار احیاء الکتب العربیۃ، 1960م، ص 231

2۔سنت نبوی جو محو ہو چکی تھی، کا احیاء۔

3۔بدعات کا خاتمہ۔

بیضہ کے مقام پر جب امام عالی مقام کی برخورد حر کے لشکر سے ہوئی تو ایک خطبہ ارشاد فرمایا: اے لوگو رسولؐ خدا نے فرمایا کہ جو کوئی بھی کسی ظالم حاکم کو دیکھے کہ اس نے حرام خدا کو حلال کر دیا ہے، عہد خدا وند متعال کو توڑا ہے، سنت رسول اللہ کی مخالفت کی ہے، لوگوں کے ساتھ گناہ اور ظلم وستم کے ساتھ برتاو کرتا ہے، لیکن پھر بھی اس ظالم حکمران کے خلاف قولاً یا فعلاً قیام نہیں کرتا تو خدا کا حق ہے کہ اس شخص کا ٹھکانہ بھی جہنم کو قرار دے۔ اے لوگو جان لو کہ یہ لوگ شیطان کے پیروکار ہیں، فرمان الٰہی کو پامال کرتے ہیں، فساد کو نمایاں کرتے ہیں، حدود خدا کو معطل کرتے ہیں، بیت المال کو اپنے ساتھ خاص کرتے ہیں اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال کرتے ہیں۔ اور امت کی اصلاح اور ان حالات کو بدلنے کے لیے میں مناسب ترین فرد ہوں۔[1]

خرافاتِ قیام حسینی کی عصر حاضر میں منظر کشی:

قیام حسین ابن علی علیہما السلام کی جو عالمی تحریک تھی وہ ہم تک کسی صورت میں پہنچ رہی ہے اس سارے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے۔ جوش ملیح آبادی نے ''ذاکر سے خطاب'' کے زیر عنوان نظم میں کچھ یوں لکھا ہے:

سوچ تو اے ذاکر افسردہ طبع نرم خو
آہ تو نیلام کرتا ھے شہیدوں کا لہو
تاجرانہ مشق ہے مجلس میں تیری ہاؤ ہو
فیس کا دریوزہ ہے منبر پر تیری گفتگو
عالم اخلاق کو زیر و زبر کرتا ہے تو
خون اہل بیتؑ میں لقمے کو تر کرتا ہے تو
حرص نے تجھ کو سکھایا ہے دنایت کا سبق
کربلا کے ذکر میں لیتا نہیں کیوں نام حق
کربلا و خون مولا کو تماشہ کر دیا
آب رکنا باد و بستان مصلیٰ کر دیا

---

[1] طبری، ایضاً، ج4،ص304، بلاذری، ایضاً، ج3،ص381، ابن اعثم، ایضاً، ج5،ص8281، خوارزمی، ایضاً، ج1،ص 335۔ سبط بن جوزی، تذکرۃ الخواص، ص241، مجلسی، ایضاً، ج44،ص381

مشق گریہ، عیش کی تمہید ہے تیرے لیے
عشرہ ماہ محرم عید ہے تیرے لیے
خوف ہے قربانیِٔ اعظم نظر سے گر نہ جائے
ابن حیدر کے لہو پر دیکھ پانی پھر نہ جائے
ساز عشرت ہے تجھے ذکر امام مشرقین
ڈھالتا ہے تیرے سکے بستگانِ غم کا بین
تیری دار الضرب ہے اہلِ عزا کا شور و شین
سر جھکا لے شرم سے اے تاجرانِ خونِ حسین

مذکورہ نظم لکھنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہم شیعہ احباب کی دل آزاری کررہے ہیں، بلکہ ہم تو احباب ملت کو اس عاشورہ پر مبنی تحریک کے اصل مقصد و ہدف کی طرف توجہ مبذل کروانا چاہتے ہیں، حالانکہ میں تو ڈاکٹر اسرار احمد کے ان الفاظ کی من وعن تائید وتصدیق کرتا ہوں: یہ شیعوں کا تاریخی عزم و استقلال ہے جو واقعہ کربلا کو فراموش نہ ہونے دیا ورنہ اموی ذہنیت تو جلا ہوا کعبہ، اجڑا ہوا مدینہ تک چھپا گئی۔

عاشورہ ایک عالمی احتجاجی تحریک:

ہم سمجھتے ہیں کہ عالمی منظر نامہ میں جو ایک حق وباطل کا بیانیہ مرتب ہو چکا ہے اُس کے تناظر میں عاشورہ جو ایک عالمی احتجاجی تحریک ہے، اس پر فقط ایک مکتب، مسلک، کی اجارہ داری نہیں ہے، بلکہ یہ تحریک عصر حاضر میں ہر غلامانہ ذہنیت سے آزادی کی ایک عالمی تحریک بن چکی ہے، یہ تحریک اب کسی رنگ ونسل، مذہب، مکتب، مسلک کی نہیں بلکہ عالمی نجات دہندہ کی پیش قدمی ہے، اب جہاں بھی عاشورہ محرم الحرام کی مجالس منعقد کی جاتی ہیں، وہاں کے احباب اپنا طرز عمل ایسا رکھیں کہ احباب اہل سنت ودیگر افراد قوم وملت جوق درجوق اس عالمی احتجاجی تحریک میں شریک ہوں، رسومات محرم سے زیادہ مقاصد عاشورہ، اہداف عاشورہ کو فوقیت دیں۔ کئی مجالس میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہاں کچھ اس طرح کی علاقائی رسومات کے نام پر حرکات وسکنات کی جاتی ہیں جو درحقیقت قیام حسین ابن علیؑ کے اہداف ومقاصد سے یکسر مختلف ہیں۔

❑❑❑❑❑



مقصد قیام امام حسینؑ، بقائے اسلام، احترام انسانیت

تحریر: ندیم عباس
پی ایچ ڈی اسکالر نمل یونیورسٹی اسلام آباد

دنیا میں اٹھنے والی تمام تحریکیں کسی نہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے معرض وجود میں آتی ہیں، جس تحریک کا مقصد جس قدر بلند ہو اس تحریک کو اوراق تاریخ میں اتنی ہی قدر و منزلت ملتی ہے اور اچھے الفاظ میں یاد رکھی جاتی ہے۔ اس کے مدمقابل اگر کسی تحریک کا مقصد فتنہ و فساد اور انسانیت پر ظلم ستم ہو تو اس تحریک کی تاریخ سیاہ دھبوں کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ بہت ساری تحریکیں طوفان کی طرح اٹھتی ہیں، چند دن ان کا بڑا شور ہوتا ہے، پھر تھوڑے عرصے بعد فقط ان کی گرد رہ جاتی ہے۔ مقصد کا پست ہونا تحریک کے خاتمے کا باعث بن جاتا ہے۔ کسی بھی تحریک کا مشاہدہ کرنے کے لیے اس تحریک کے مقاصد کا جاننا بہت ضروری ہے۔ عظیم مقاصد کی حامل تحریکیں ہی عظیم ہوتی ہیں۔ مقاصد کی وسعت تحریک میں وسعت کا باعث بنتی ہے۔ اس سے تحریک چلانے والے کی حیثیت، سوچ، فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں ایک انتہائی اہم نقطہ ذہن میں رہے، عظیم مقاصد عظیم قربانیاں مانگتے ہیں، مقصد جتنا بڑا ہوگا اس کے حصول کے لیے اتنی زیادہ جدوجہد کرنی پڑے گی اور اتنی ہی زیادہ قربانیاں دینا پڑیں گی۔

کربلا ایک الٰہی انقلابی تحریک ہے، اس نے انسانی زندگی پر دنیا میں چلنے والی تمام تحریکوں سے زیادہ اثرات چھوڑے ہیں۔ ٦١ ہجری سے لے کر آج تک ١٤ صدیاں ہوگئیں ہیں مگر آج بھی یہ تحریک تر و تازہ ہے۔ دنیا کے جس حصے میں چلے جائیں، وہاں کسی نہ کسی صورت میں ذکر کربلا ضرور ہوگا۔ آج یہ تحریک دنیا میں آزادی اور حریت کا نشان بن چکی ہے۔ اس تحریک نے انسانیت کو اس کی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ عزم، ہمت، حوصلے اور استقامت کی علامت بن چکی ہے۔ انسانی آزادی کے لیے چلنے والی تمام تحریکیں اس تحریک سے رہنمائی حاصل کرتی ہیں۔ اس عظیم تحریک کا مقصد کیا تھا؟ یہ کیوں برپا کی گئی؟ حریت انسانیت کے لیے چلنے والی اس تحریک کے الٰہی قائد خود اپنے بھائی کے نام اپنی وصیت میں اس مقصد کو بیان فرماتے ہیں۔

''میرا نکلنا نہ خود پسندی اور تفریح کی غرض سے ہے اور نہ میرا مقصد فساد اور ظلم کرنا ہے، میں صرف اس لیے نکلا ہوں کہ اپنے نانا کی امت کی اصلاح کروں، میں چاہتا ہوں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انجام دوں اور یوں اپنے نانا اور اپنے والد کی سیرت کی پیروی کروں۔''

امام کے ان جملوں پر غور کریں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ امام نے ان تمام وجوہات کی نفی کر دی، جن وجوہات پر اس زمانے میں جنگ ہوا کرتی تھی۔ مثلاً لوگ خود پسندی اور اپنی لڑائی جھگڑے والی طبیعت کی وجہ سے جنگیں کرتے تھے۔ خود پسندی جیسی برائی تربیت یافتہ نبوت کے دل دماغ میں کیسے آسکتی ہے۔ دوسرا لوگ ظلم کرنے اور فساد پھیلانے کے لیے کشت وخون کرتے ہیں۔ امام حسینؑ نے ظلم کے خاتمے اور فساد کی جڑیں کاٹنے کے لیے قیام فرمایا۔ آپ تو پیکر عدل اور عظیم مصلح تھے، ایسا کیوں نہ ہو آپ اس ہستی کے فرزند ہیں جن کے بارے میں مشہور عیسائی مصنف جارج اپنی مشہور زمانہ تصنیف ندائے عدالت انسانی میں لکھا ہے کہ علیؑ کو ان کے شدت عدل کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ خود حضرت علیؑ فرماتے ہیں" دنیا کے ہر حکمران سے دشمنی اس کے ظلم کی وجہ سے کی گئی، میں واحد حکمران ہوں میرے ساتھ دشمنی میرے عدل کی وجہ سے کی گئی۔" امام حسینؑ اپنے بابا کی اسی سیرت عدل کو زندہ کرنے کے لیے قیام فرما رہے ہیں۔

امام نے اپنے قیام کا مقصد اپنے نانا کی امت کی اصلاح کو قرار دیا۔ اصلاح بہت وسیع مفہوم رکھتی ہے، اس وقت کے حالات کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ امت مسلمہ میں اسلام فقط نماز روزے کی حد تک محدود ہو چکا تھا۔ اسلام بطور نظام زندگی کا تصور دم توڑ رہا تھا، لوگ فقط عبادات کو دین سمجھتے تھے، ظلم و بربریت کا دور دورہ تھا، آمریت اسلامی معاشرے کو اپنے پنجوں میں جکڑ چکی تھی۔ اسلام کے نوزائیدہ شجر کی جڑیں کھوکھلی کی جارہی تھیں، اسلامی اقدار پامال کی جارہی تھیں، لادینیت کو دین کے لبادے میں پیش کیا جارہا تھا اور اس پر ظلم یہ کہ لوگ اسی کو حقیقی اسلام سمجھ رہے تھے۔ ایسے امام حسینؑ اسلام کا حقیقی چہرہ دکھانے کے لیے اور ان خرافات کو ختم کرنے کے لیے سامنے آتے ہیں۔

امام نے امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کو اپنے قیام کا مقصد قرار دیا۔ کوئی کم سوچ وفکر رکھنے والا یہ کہ سکتا ہے کہ یہ کوئی بڑا مقصد نہیں ہے، جس کے لئے اتنی بڑی تحریک شروع کی جائے، اپنا گھر بار چھوڑا جائے، حج جیسی عظیم عبادت کو ترک کیا جائے، سفر کی مشکلات کے بعد کربلا کے لق ودق صحرا میں اپنے کنبے کو جانثاروں سمیت شہید کرایا جائے۔ یہ امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ اس کا دائرہ کار کیا ہے؟ اور اس میں کتنی وسعت پائی جاتی ہے؟ امر بالمعرف اور نہی عن المنکر دونوں عربی لفظ ہیں، امر بالمعروف کا مطلب ہے نیکی کا حکم دینا اور نہی عن المنکر کا مطلب ہے برائی سے روکنا۔ مثلاً عدل کرنا، علم پھیلانا، اولاد کی تربیت کرنا، والدین کے حقوق ادا کرنا، استاد کا احترام، اہل حق کی اطاعت کرنا، معاشرے میں مساوات قائم کرنا، تعلیم عام کرنا، جہالت ختم کرنا، غرباء ومساکین کا خیال رکھنا، نماز روزے کا حکم دینا، عادلانہ نظام حکومت کو قائم کرنا، یہ تمام نیکیاں ہیں، ان کا حکم دینا امر بالمعروف کہلاتا ہے۔

اسی طرح ظلم کرنا، ظالم کا مددگار بننا، غربا و مساکین کا حق ادا نہ کرنا، ظلم وتشدد کرنا، والدین اور اولاد کے حقوق ادا نہ کرنا، نماز روزے کو ترک کرنا، ظالم نظام حکومت کا حصہ بننا، یہ سب برائیاں ہیں اور ان سے روکنا نہی عن المنکر کہلاتا ہے۔ یعنی امر بامعروف اور نہی عن المنکر کرنا ایسا ہے جیسے تمام اچھائیوں کا حکم دینا اور تمام برائیوں سے روکنا۔ دنیا کے جس معاشرے میں امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کا رواج ہو جائے وہ معاشرہ جنت نظیر معاشرہ ہوگا اگر سادہ لفظوں میں بیان کیا جائے تو پورا دین امر بالمعرف اور نہی عن المنکر کے دائرہ کار میں آتا ہے اور جب سید الشہداء اپنے قیام کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو قرار دیتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام پورے دین کو اپنے قیام کا مقصد قرار دے رہے ہیں۔ گویا آپ نے پورے نظام اسلام کے قیام کی بات کی ہے، حاکم کو تبدیل کرنا اس کا ایک حصہ ہے۔

اس کے بعد امام نے فرمایا کہ میں اپنے نانا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اپنے بابا علیؑ کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں۔ آپ کے نانا کی سیرت کیا تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام تر مشکلات کے باوجود تبلیغ اسلام کا آغاز کیا اور اس سلسلہ میں آنے والی تمام تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ آپ پر کیا کیا مظالم نہیں ڈھائے گئے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سلسلہ تبلیغ بڑھتا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں ان تمام مظالم کو برداشت کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چاروں طرف سے یلغار کر دی گئی۔ پورا عرب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدمقابل آ گیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ اسلام کو جاری رکھا۔ آپ کے بابا علیؑ کی سیرت بھی یہی ہے۔ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جان نثار بن کر رہے، ہجرت کے بعد مدینہ میں لشکر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علمدار بن کر رہے، جب بھی اسلام پر کوئی مشکل آتی حضرت علیؑ آگے بڑھ کر اس مشکل کا خاتمہ کر دیتے۔ جب آپؑ کو ظاہری خلافت ملی تو آپ نے اسلام ناب محمدی کے احیاء کی بھرپور کوششیں کیں اور اس کے لیے تین خطرناک جنگیں لڑیں۔ آپ کی یہ کوششیں آپؑ کی شہادت تک جاری رہیں۔ امام حسینؑ جب یہ کہتے ہیں کہ میں نانا اور بابا کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہر صورت میں لوگوں کو دعوت حق دوں گا۔ اگرچہ تم میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے ہاتھ پر سورج رکھ دو۔ اگر کفار سے مقابلہ ہوگا تو نانا کی سیرت سامنے ہے اور اگر نام نہاد مسلمانوں سے مقابلہ ہوگا تو بابا کی سیرت پر چلتے ہوئے ان کا مقابلہ کروں گا۔

امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے یہ کہتے ہوئے انکار کیا "مثلی لا یبایع مثلہ مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرے گا" یہ امام کی پالیسی سٹیٹمنٹ ہے، جو قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ دیکھو جب بھی کسی ظالم، جابر، آمر کی اطاعت کا سوال ہو تو سیرت حسینؑ یہ ہے سر دے دینا، بیعت نہ کرنا۔ کیونکہ انسان قتل ہونے سے نہیں مرتا بیعت قبول کر کے اپنے نظریے کی موت سے مر جاتا ہے۔ بقول شاعر

جب بھی ضمیر کا سودا ہو دوستو!
تو ڈٹ جاؤ حسین کے انکار کی طرح

امام حسینؑ مکہ تشریف لاتے ہیں، مکہ عالم اسلام کا مرکز ہے، امام کے آباء و اجداد کا مسکن ہے، دنیا بھر کے مسلمان یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں۔ یہاں سے اپنا پیغام دنیا بھر کے مسلمانوں تک پہنچانا آسان ہے، سب سے بڑھ کر یہاں بیت اللہ ہے اور مکہ حرم خدا ہے۔ یہاں ہر انسان کو امن حاصل ہے۔ اس لیے امام یہاں قیام فرماتے ہیں۔ حج کا آغاز ہوتا ہے، آپ کو پتہ چلتا ہے کہ حکومت وقت نے حرمت کعبہ کو پامال کرنے کا ناپاک منصوبہ بنایا ہے اور حاجیوں کے لباس میں آپ کو قتل کرنے کے لیے آدمی بھیجے گئے ہیں۔

آپ سے زیادہ حرمت کعبہ کا کسے پاس ہوگا، آپ کعبہ کو اپنے لیے بطور ڈھال استعمال نہیں کرتے بلکہ کعبہ کے لیے ڈھال بن جاتے ہیں۔ حج جیسی عظیم عبادت کے احرام کو توڑ دیتے ہیں۔ اس طرح امام نے اس وقت کے بڑے میڈیا کا بھرپور استعمال کیا۔ پورے عالم اسلام کے لوگ موجود ہیں، ان کے سامنے جب احرام کو توڑا اور حج کو چھوڑ کر جا رہے ہیں تو ہر حاجی پوچھتا ہے کہ نواسہ پیغمبر نے کیوں احرام توڑا ہے؟ وہ کہاں کا ارادہ رکھتے ہیں؟ وہ وہاں کیوں جا رہے ہیں؟ ان کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ سب معلوم کرنے کے بعد جب یہ سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جاتے ہیں تو سید الشہداءؑ کا پیغام بھی گھر گھر پہنچ جاتا ہے۔ امامؑ نے مکہ چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ اب کہاں کا سفر اختیار کیا جائے، یہ ایک انتہائی اہم فیصلہ ہوگا۔ یہاں امام نے تمام لوگوں کی مخالفت کے باوجود کربلا کا سفر کیوں اختیار کیا؟ اگر ہم اس وقت کے حالات کا جائزہ لیں کہ امام کے پاس کیا آپشنز تھے؟ کیا امام نے کوفہ جانے کا جو فیصلہ کیا یہ درست تھا؟ ان حالات میں کہ اہل کوفہ آپ کے والد اور بھائی کے ساتھ بے وفائی کر چکے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ امام حسینؑ کے قیام کا آغاز مدینہ سے ہو چکا ہے۔ آپ یزید کی بیعت نہ کرنے کا اعلان فرما چکے ہیں۔ اس میں اہل کوفہ کے خطوط کا کوئی کردار نہیں، کیونکہ ان کے خطوط مکہ میں ملے ہیں۔ امام کے پاس اس وقت کیا آپشنز موجود تھے۔ مدینہ آپ چھوڑ چکے ہیں، وہاں بنوامیہ کا مکمل قبضہ ہے، مکہ میں حرمت کعبہ کے پامال ہونے کا خطرہ ہے، یمن اور بصرہ کے حالات بھی کسی طرح سے آپ کے لیے سازگار نہیں ہیں اور شام میں خود یزید موجود ہے۔ اس تمام صورت حال میں صرف کوفہ ایسی جگہ ہے جو کسی بھی تحریک کے چلانے کے لیے انتہائی سازگار جگہ ہے۔ یہاں آپ کے والد اور بھائی کے اصحاب کی ایک جماعت موجود ہے۔ کوفہ ایک فوجی شہر ہے، یہاں سے ایک بڑی سپاہ میسر آسکتی ہے۔ یہ تمام وجوہات درست تھیں کیونکہ جب آپ کے خون کے انتقام کے لیے توابین اور بعد میں امیر مختار نے تحریک کا آغاز کیا تو ہزاروں لوگ انتقام خون حسینؑ کے لیے نکلے اور امام کے قاتلوں سے انتقام لیا۔

دوسرا اہل کوفہ کے ہزاروں خطوط آپ کے پاس آرہے ہیں۔ ان کے قاصد پہ قاصد آرہے ہیں، جو آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس طرح اتنی بڑی تعداد میں کسی اسلامی شہر سے دعوت نہیں آرہی، آپ ان تمام خطوط اور کے قاصدوں کے باوجود خود تشریف نہیں لے جاتے بلکہ اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیلؑ کو اپنا قاصد بنا کر کوفہ بھیجتے ہیں کہ انھوں نے جو رپورٹ دی اس کے مطابق عمل کیا جائے گا۔ اسی لیے جب حضرت مسلمؑ نے اہل کوفہ کے آمادہ نصرت ہونے کی اطلاع دی تو اس

وقت امام نے کوفہ جانے کا فیصلہ کیا۔ امام نے احتیاط کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ ہم فرض کرتے امام کوفہ نہیں جاتے بلکہ کسی دوسرے اسلامی شہر چلے جاتے یا مکہ میں ہی رہتے اور وہاں اسی طرح بے دردی شہید کر دیے جاتے تو آج جو لوگ امام کے کوفہ جانے پر معترض ہیں، یہ کہہ رہے ہوتے امام کو جب کوفہ سے اتنی دعوتیں مل رہی تھیں، ان کو قبول کر کے کوفہ کیوں نہ چلے گئے۔ امام کا یہ انتخاب ہر لحاظ سے درست تھا۔ اسی لیے کرفیو کے باوجود کربلا میں سب زیادہ شہداء اہل کوفہ میں سے ہیں۔

امام حسینؑ نے اصول جنگ اور آداب جنگ کو ہی تبدیل کر دیا، جنگ میں انسان دشمن سپاہ کے درپے ہوتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ جیسے ہی دشمن کا کوئی سپاہی میری دسترس میں آئے اور میں اس کا سر قلم کر دوں۔ مگر نواسہ پیغمبر تو انسانیت بچانے نکلے ہیں، دنیا کو احترام انسانیت کا درس دینا ہے، اسی لیے جب حر بن یزید ریاحی ایک بڑے لشکر کو لیکر آپ سے جنگ کرنے کے لئے آتے ہیں، لشکر کی حالت یہ ہے کہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے پورا لشکر قریب المرگ ہے۔ ان کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جا سکتا ہے، بلکہ ان کو مارنے کے لیے تیروں، تلواروں اور نیزوں کی ضرورت ہی نہیں، یہ پانی نہ ملنے کی وجہ سے خود ہی مر جاتے۔ اگر ان کے مدمقابل کوئی اور لشکر ہوتا تو یقیناً یہی کرتا، مگر امام لشکر کے ساتھ حسن سلوک کی وہ اعلٰی مثال قائم کرتے ہیں جو رہتی دنیا تک کے انسانوں کے لیے ہدایت کا کام دیتی رہے گی۔

امام کے پاس وافر مقدار میں پانی موجود تھا، جب دشمن کے لشکر نے پانی مانگا تو امامؑ نے حکم دیا کہ تمام لشکر کو پانی پلایا جائے۔ امام کے اصحاب نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور ان لوگوں جو انھیں قتل کرنے کے لیے آئے تھے، ان کو پانی پلایا، جب یہ پانی پی چکے تو امام نے حکم دیا ان کے جانوروں کو پانی پلاؤ اور دیکھنا گھوڑا ایک دفعہ پانی پینے سے سیر نہیں ہوتا، اس لیے اس وقت تک پانی نہ ہٹانا جب تک وہ منہ نہ موڑ لے۔ آج چودہ صدیوں بعد دنیا جانوروں کے حقوق کی بات کرتی ہے، نواسہ پیغمبر نے چودہ صدیاں پہلے جس طرح انسانی پیاس کی شدت کو محسوس کیا، اسی طرح جانوروں کی پیاس کا خیال رکھا۔ یہ اقدار عاشورا ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے بہن بھائیوں سے ناراض رہتے ہیں، ہمیں امام کے اس طرز عمل سے سبق لینا چاہیے کہ دشمنی میں بھی اسلامی اور انسانی اقدار کی پاسداری کی جائے۔

امام حسینؑ زبالہ کے مقام پر پہنچے تو آپ کو ایک خط ملا، جس میں حضرت مسلمؑ، حضرت ہانی رضی اللہ تعالٰی عنہ اور حضرت عبداللہ بن یقطر رضی اللہ تعالٰی عنہ کی شہادت کی خبر تھی اور ساتھ ہی اہل کوفہ کی بے وفائی کا تذکرہ تھا، آپ یہ خط پڑھنے کے بعد اپنے اصحاب کو خطبہ ارشاد فرماتے ہیں، جس میں اس واقعہ کی اطلاع دیتے ہیں اور حالات کے رخ تبدیل ہو جانے کا بتاتے ہیں۔ اس کے بعد تاریخی جملے ارشاد فرماتے ہیں "فمن احب منکم الانصراف فلینصرف لیس علیه منا ذمام تم میں سے جو کوئی جانا چاہے وہ آزاد ہے اور ہماری طرف سے اس پر کوئی حق نہیں ہے۔" اگر دنیا کا طالب کوئی حکمران ہوتا تو لوگوں سے حالات کو چھپاتا، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ساتھ رہیں کیونکہ جہاں جا رہے ہیں، وہاں خطرہ پہلے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ لوگ ساتھ چھوڑ چکے ہیں، زیادہ مددگاروں کی ضرورت ہے، مگر یہ کوئی عام رہنما نہیں، کوئی عام تحریک نہیں، رہنما حسینؑ ہے اور تحریک کربلا

ہے۔ یہاں کسی بے خبر اور بے علم کی کوئی گنجائش نہیں۔ سب صاحب معرفت ہونے چاہئیں، سب کو معلوم ہو حالات کیسے ہیں، احیاء دین اسلام اور بقائے شریعت محمدی جیسے عظیم مقصد کے لیے اٹھنے والی تحریک میں وہی لوگ شامل ہونے چاہیں جو بابصیرت ہوں ایمان کی اس منزل پر فائز ہوں، جن کے لیے مقصد اہم ہو زندگی اور موت ان کے لیے کوئی حیثیت نہ رکھتے ہوں۔

امام نے گویا یہاں سے اس تحریک میں شامل ہونے والوں کے لیے امتحان کا آغاز کر دیا کہ اس تحریک میں فقط وہی لوگ شامل ہو سکتے ہیں، جن کو جان سے زیادہ مقصد عزیز ہو، اسی لیے امام نے کوفہ کے سارے حالات بتا دیئے، تا کہ ان کو معلوم ہو کہ جس شہر میں وہ جا رہے ہیں وہ شہر اب پھولوں سے نہیں بلکہ تیروں اور تلواروں سے ان کا استقبال کرنے والا ہے۔ وہاں زندگی کی آسائشیں نہیں قربانیاں ہی قربانیاں ہیں، وہاں زندگی نہیں موت ہے۔ امام کے اس اعلان کے بعد کچھ لوگ جو فقط مال دنیا کے لیے آپ کے ساتھ ہو لیے تھے، واپس چلے گئے۔ وہ اس قابل ہی نہ تھے کہ اس تحریک میں شامل ہوتے، وہ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم نے اپنی جان بچالی، ہم زندہ رہ گئے، مگر یہ ان کی بھول تھی، زندہ فقط وہی رہے جو اس الٰہی قافلے میں شامل ہو گئے۔ ان کا ایک ایک کردار تاریخ میں ثبت ہو گیا۔ امام حسینؑ آزادی بشر کے بہت بڑے داعی تھے، آپ نے کسی فرد کو اپنی تحریک میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا، ہر آدمی کو مکمل اختیار دیا کہ وہ اپنی مرضی سے اس تحریک میں شامل ہو۔

آپ نے دس محرم کی رات اپنے اصحاب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ میرے خیال میں کل میرے اور ان کے درمیان جنگ کا دن ہوگا، میں آپ سب کو چلے جانے کی اجازت دیتا ہوں، میں نے آپ سب پر سے اپنی بیعت اٹھالی ہے، آپ لوگوں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، رات کی تاریکی نے آپ سب کو چھپایا ہوا ہے، اس سے فائدہ اٹھایئے ہر شخص میرے اہلبیت میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام کر اس کے ساتھ یہاں سے چلا جائے۔۔۔۔۔ یہ لوگ میرے درپے ہیں، اگر مجھے مار لیں گے تو پھر دوسروں سے انھیں کوئی سروکار نہیں ہوگا۔ امام یہ جملے اس رات کو ارشاد فرما رہے ہیں، جس کی صبح جنگ ہونی ہے۔ امام تمام لوگوں حتی اپنے رشتہ داروں کو جانے کا کہہ رہے ہیں۔ ساتھ میں فرما رہے ہیں کہ اندھیرا ہے چلے جاؤ، اس کی وجہ سے شرمندگی بھی نہ ہوگی۔ تمام ذمہ داریوں کو ختم فرما رہے ہیں کہ کسی کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، بیعت اٹھا رہے ہیں، غرض ان کے جانے کے تمام موانع کو ختم کر دیتے ہیں۔

یہ آزادی سوائے تحریک کربلا کے کہیں نظر نہیں آتی، اسی لیے یہ ہر تحریک سے منفرد ہے، دنیا کی تحریکوں میں ان تحریکوں کے سربراہ عوام اور افواج کو لڑاتے ہیں، خود محفوظ پناہ گاہوں میں رہتے ہیں، مگر تحریک کربلا کا رہنما کہتا ہے کہ تم چلے جاؤ، میں شہید ہونے کے لیے تیار ہوں، یہ حقیقی آزادی ہے۔ امام اپنے ساتھیوں کو کل پیش آنے والے واقعات کے لیے تیار کر رہے ہیں، کیونکہ دس محرم کا دن کوئی عام دن نہیں ہے، یہ اسلامی اقدار کی بقا کا دن ہے، یہ کٹ جانے، شہید ہو جانے کا دن ہے، یہ انسانیت کی معراج کا دن ہے، اس دن جو کردار سامنے آئیں گے وہ قیامت آنے والے انسانوں کے لیے نمونہ عمل بن جائیں گے۔ دس محرم کی تیاری کے لیے یہ آخری امتحان ہے کہ کل کہیں موت کو سامنے دیکھ کر کوئی ڈر نہ جائے یا دشمن سے مرعوب نہ ہو جائے، اسی آزادی کا نتیجہ ہے کہ دس محرم کو لشکر یزید سے لوگ مرنے کے لیے امام کے لشکر میں آئے ہیں، مگر لشکر حسینی کا کوئی سپاہی زندہ رہنے کے لیے لشکر امام

کو چھوڑ کر لشکر یزید میں شامل نہیں ہوا کیونکہ یہ لوگ حقیقت زندگی سے آشنا ہو چکے تھے، موت کو مقصد بنا چکے تھے، شہادت کو منزل کے طور دیکھ رہے تھے اور یہ انسانی فطرت ہے ہر انسان مقصد اور منزل تک جانا چاہتا ہے۔

امام کے اعوان و انصار نے امام کے اس خطبے کے بعد جو ایمان افروز تقاریر کیں، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ آپ کے بھائی حضرت عباسؑ کھڑے ہوئے اور فرمایا: خدا ہمیں کبھی ایسا دن نہ دکھائے کہ آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ حضرت مسلمؑ کے بھائیوں نے فرمایا: خدا کی قسم ہم ہرگز آپ کو چھوڑ کر نہیں جائیں گے، اپنا مال، جان، اولادیں آپ پر قربان کر دیں گے۔ حضرت مسلم بن عوسجہ نے فرمایا: خدا کی قسم آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، اپنے نیزے سے آپ کے دشمنوں کے سینے چھید ڈالوں گا۔ امام کے صحابی حضرت سعد بن عبداللہؓ نے فرمایا: خدا کی قسم اگر مجھے معلوم ہو کہ ستر مرتبہ مارا جاؤں گا اور ہر مرتبہ زندہ ہونے کے بعد آپ کی مدد کروں گا، ہر مرتبہ میرے جسم کو جلا کر راکھ کرنے کے بعد زندہ کیا جائے گا، تب بھی آپ کا ساتھ نہیں چھوڑں گا۔ زہیر بن قینؓ نے فرمایا: اے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی قسم میں تو چاہتا ہوں آپ کی حمایت میں ہزار بار مارا جاؤں۔

اس ردعمل پر امام نے اپنے اصحاب کو دعا دی، امام نے اپنے اصحاب کو جو آزادی دی، آپ دس محرم کے دن دشمن سے خطاب میں ان سے بھی اسی آزادی کا تقاضا کرتے ہیں، ان سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں "**ان لم یکن دین و کنتم لا تخافون المعاد فکونوا احرارا فی دنیاکم** اگر تمھارا کوئی دین نہیں اور تم کو قیامت کا خوف بھی لاحق نہیں ہے تو اپنی دنیا کی زندگی میں تو آزاد رہو غلامی کی زندگی نہ گزارو۔"

انہی بے نظیر و بے مثال خوبیوں کی وجہ سے تحریک کربلا انسانیت کی آزادی کے چلنے والی تمام تحریکوں کی رہنمائی کرتی ہے، ان تحریکوں کے رہنما نواسہ پیغمبر کی سیرت و کردار کو اپنے لیے مشعل راہ سمجھتے ہیں جو خود شہید ہو گئے مگر ان الٰہی اقدار کو پامال ہونے سے بچا لیا۔ شاعر اہلبیتؑ شیخ کاظم یزدی نے کہا تھا

قد غیر الطعن منهم کل جارحة الا المکارم فی امن من الغیر

دشمن کے نیزوں نے ان کے سارے بدن کو بدل کر رکھ دیا، لیکن ان کی عظمت اور بلند ارادے تبدیلی سے محفوظ رہے۔

شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ اقبال نے کہا تھا:

انسان کو بیدار تو ہو لینے دو
ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

□□□□□

شبِ عاشور: امام حسینؑ کا اصحابِ وفا کو اختیار دینا

اور وفادار ساتھیوں کا جان نثاری کا عہد

تحریر: سید انجم رضا

واقعۂ کربلا تاریخِ اسلام کا وہ عظیم باب ہے جس میں ایمان، وفا، بصیرت، صبر اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثالیں انسانی تاریخ کے سامنے پیش کی گئیں۔ عاشورا کے دن کا معرکہ اگرچہ چند گھنٹوں پر محیط تھا لیکن اس کے پیچھے برسوں کی فکری، روحانی اور اخلاقی تربیت کا ایک عظیم پس منظر موجود تھا۔ امام حسین بن علیؑ نے کربلا میں صرف ایک سیاسی مقابلہ نہیں کیا بلکہ انسانی اقدار، دینی اصولوں اور حق و باطل کے درمیان ایک ابدی معیار قائم کیا۔

شبِ عاشور کا واقعہ اسی عظیم تربیت اور وفاداری کی انتہا ہے، جب امام حسینؑ نے اپنے قلیل مگر عظیم المرتبت اصحاب کو جمع کیا، چراغ بجھا دیا اور انھیں یہ اختیار دیا کہ اگر کوئی شخص چاہے تو اندھیرے میں خاموشی سے میدان چھوڑ سکتا ہے لیکن اصحابِ حسینؑ نے دنیا کی زندگی، مال و مقام اور اپنی جانوں پر امام کی نصرت اور حق کی سربلندی کو ترجیح دی۔

شبِ عاشور کا پس منظر

دسویں محرم کی رات سے پہلے حالات انتہائی سنگین ہو چکے تھے۔ یزیدی لشکر کی تعداد ہزاروں میں تھی جبکہ امام حسینؑ کے ساتھ موجود افراد کی تعداد بہت کم رہ گئی تھی۔ پانی بند کر دیا گیا تھا، جنگ یقینی ہو چکی تھی اور ہر شخص جانتا تھا کہ اگلا دن شہادتوں کا دن ہوگا۔

ایسے نازک وقت میں امام حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کے ایمان اور اخلاص کو مزید واضح کرنے کے لیے انھیں ایک خصوصی مجلس میں جمع کیا۔ تاریخی روایات کے مطابق امامؑ نے اپنے اصحاب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ دشمن کو صرف میری ذات سے غرض ہے، لہٰذا میں تم سب کو اجازت دیتا ہوں کہ میری بیعت سے آزاد ہو جاؤ اور رات کی تاریکی میں یہاں سے چلے جاؤ۔ جو شخص جانا چاہے، اسے کوئی ملامت نہیں ہوگی۔

یہ خطاب امام حسینؑ کی عظمتِ کردار، قیادت کے اصول اور اپنے ساتھیوں کے احترام کی روشن دلیل ہے۔ ایک قائد اپنے

ساتھیوں کو جنگ کے خطرے میں مجبور نہیں کر رہا بلکہ انھیں مکمل اختیار دے رہا ہے۔

چراغ بجھانے کا فلسفہ

شبِ عاشور چراغ بجھانے کا واقعہ صرف ایک تاریخی تفصیل نہیں بلکہ اپنے اندر گہری معنوی حکمت رکھتا ہے۔

امام حسینؑ چاہتے تھے کہ کسی شخص کی موجودگی محض شرمندگی، سماجی دباؤ یا حالات کے اثر میں نہ ہو۔ چراغ بجھا کر امامؑ نے گویا یہ موقع دیا کہ جو شخص جانا چاہتا ہے وہ بغیر کسی احساسِ شرمندگی کے چلا جائے، کیونکہ امامؑ کسی ظاہری تعداد یا دنیاوی طاقت کے خواہاں نہیں تھے بلکہ ایسے ساتھی چاہتے تھے جو شعوری ایمان اور مکمل معرفت کے ساتھ کھڑے ہوں۔ یہ عمل اسلامی قیادت کے اس اصول کو ظاہر کرتا ہے کہ حقیقی رہنما انسان کو اختیار، شعور اور آزادی دیتا ہے، نہ کہ جبر کے ذریعے ساتھ رکھتا ہے۔

اصحابِ حسینؑ کا جواب: وفا کی لازوال مثال

مئی تا جولائی 2026

امام حسینؑ کے خطاب کے بعد اصحاب نے جو جواب دیا وہ تاریخِ وفا کا عظیم ترین باب بن گیا۔ سب سے پہلے خاندانِ بنی ہاشم اور پھر اصحاب نے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عباس بن علیؑ، حضرت مسلم بن عوسجہؓ، حضرت حبیب بن مظاہرؓ، حضرت زہیر بن قینؓ اور دیگر اصحاب نے عرض کیا کہ ہم آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں؟ اگر ہمیں کئی مرتبہ قتل کیا جائے، ہمارے جسموں کو جلایا جائے اور پھر زندہ کر کے دوبارہ قتل کیا جائے، تب بھی ہم آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ یہ الفاظ محض جذباتی وابستگی کا اظہار نہیں تھے بلکہ امام کی معرفت، مقصد کی پہچان اور حق کے راستے پر کامل یقین کی علامت تھے۔

حضرت عباسؑ کی وفاداری

شبِ عاشور کے وفادار کرداروں میں حضرت عباس بن علیؑ کا مقام نمایاں ہے۔ آپ علمبردارِ لشکرِ حسینؑ تھے اور آپ کی پوری زندگی اطاعت، وفاداری اور ولایت کے شعور سے عبارت تھی۔ آپ جانتے تھے کہ امام حسینؑ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے، حق کے نمائندے اور وقت کے امام ہیں۔ اسی لیے آپ کے لیے اپنی جان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ آپ کا کردار اس حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے کہ حقیقی وفا صرف محبت کا نام نہیں بلکہ اپنے محبوب کے مقصد کے لیے مکمل تسلیم و رضا کا نام ہے۔

حبیب بن مظاہرؓ اور مسلم بن عوسجہؓ کی بصیرت

کربلا کے اصحاب میں ایسے بزرگ بھی شامل تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیر المومنین علیؑ اور اہل بیتؑ کے زمانے کو

دیکھا تھا۔ ان کی شرکت اس بات کی دلیل تھی کہ انھوں نے حالات کا گہرا تجزیہ کرنے کے بعد حسینؑ کے راستے کو حق کا راستہ سمجھا۔ حضرت حبیب بن مظاہرؓ جیسے بزرگ صحابی نے بڑھاپے کے باوجود امام حسینؑ کا ساتھ دیا۔ ان کے لیے آرام، زندگی اور دنیاوی مصلحت سے زیادہ اہم حق کی حمایت تھی۔

اصحاب کی قربانی کا فکری پہلو

شبِ عاشور کے واقعات ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ قربانی صرف جسمانی جان دینے کا نام نہیں بلکہ اپنے مفادات، خواہشات اور دنیاوی وابستگیوں کو حق کے لیے قربان کرنا بھی قربانی ہے۔ اصحابِ حسینؑ نے ثابت کیا کہ تعداد کم ہونے سے حق کمزور نہیں ہوتا۔ ایک چھوٹا گروہ بھی اگر ایمان، بصیرت اور اخلاص رکھتا ہو تو تاریخ کا رخ بدل سکتا ہے۔

امام حسینؑ کی قیادت کا اعلیٰ نمونہ

شبِ عاشور امام حسینؑ کی قیادت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں:

اختیار کا احترام: امامؑ نے کسی کو مجبور نہیں کیا۔

مقصد کی وضاحت: امامؑ نے واضح کر دیا کہ راستہ شہادت کی طرف جا رہا ہے۔

اخلاص کی آزمائش: صرف مخلص افراد باقی رہ گئے۔

انسانی عظمت کا احترام: ہر ساتھی کو فیصلہ کرنے کی آزادی دی گئی۔

یہ اصول آج بھی قیادت، اخلاق اور اجتماعی جدوجہد کے لیے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

کربلا کا ابدی پیغام

شبِ عاشور کا واقعہ یہ پیغام دیتا ہے کہ حق کا ساتھ دینے کے لیے صرف دعویٰ کافی نہیں بلکہ ثابت قدمی، بصیرت اور قربانی ضروری ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے اصحاب نے دکھایا کہ جب مقصد مقدس ہو تو قلیل تعداد بھی عظیم انقلاب برپا کر سکتی ہے۔

اصحابِ حسینؑ نے اپنی جانیں قربان کر کے یہ ثابت کیا کہ وفا کا معیار مشکل وقت میں سامنے آتا ہے۔ آسان حالات میں ساتھ دینا کوئی بڑی بات نہیں، اصل امتحان وہ وقت ہے جب انسان کو حق اور دنیا میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے۔

اختتامیہ

شبِ عاشور کی وہ رات تاریخِ انسانیت کی ان روشن ترین راتوں میں شامل ہے جس میں چند نفوس نے اپنے ایمان اور عہد کو ہمیشہ کے لیے امر کر دیا۔ امام حسینؑ کا اپنے اصحاب کو آزادی دینا اور اصحاب کا اپنے امام کے قدموں پر جان قربان کرنے کا عزم، انسانی کردار کی بلندی، وفاداری کی عظمت اور حق پر ثابت قدمی کی بے مثال داستان ہے۔

کربلا آج بھی یہ اعلان کرتی ہے کہ ظلم کے مقابلے میں خاموشی اختیار کرنا زندگی نہیں، بلکہ حق کے لیے قربانی دینا ہی حقیقی حیات ہے۔

مقتل کی سر زمیں پہ بناتے رہے حسینؑ
اسلام کی حیات کا نقشہ تمام رات

❑❑❑❑❑



آج کی خواتین، کربلائی ماؤں کی سیرت کیسے اپنائیں؟

تحریر: سید فرخ رضا ترمذی

مئی تا جولائی
2026

کربلا صرف تلواروں کی جھنکار، شہادتوں کی داستان اور حق و باطل کے معرکے کا نام نہیں؛ کربلا دراصل ایسی عظیم ماؤں کی تربیت کا ثمر ہے جنھوں نے اپنی گود میں وفا کو پروان چڑھایا، غیرت کو جوان کیا اور ایمان کو اس بلندی تک پہنچایا کہ ان کے لعل راہِ خدا میں سر کٹوا کر بھی سرخرو ٹھہرے۔ اگر کربلا میں امام حسینؑ، حضرت عباسؑ، حضرت علی اکبرؑ، حضرت قاسمؑ اور حضرت علی اصغرؑ جیسے لازوال کردار جلوہ گر ہیں تو ان کے پس منظر میں ایسی عظیم مائیں بھی موجود ہیں جنھوں نے اپنی ممتا کو مقصدِ حق کے تابع کر دیا اور اپنی اولاد کو یہ سبق دیا کہ عزت کی زندگی حق کے ساتھ ہے اور حق کی خاطر موت بھی حیاتِ جاوداں بن جاتی ہے۔

کربلا کے تپتے ہوئے صحرا میں صرف جوانوں کے جسم خاک و خون میں نہیں نہائے تھے بلکہ ماؤں کے دل بھی صبر، رضا اور قربانی کے ایسے امتحان سے گزرے جس کی مثال تاریخِ انسانیت میں کم ہی ملتی ہے۔ ایک ماں اپنے جوان بیٹے کا لاشہ دیکھ رہی ہے، دوسری اپنے شیر خوار کی شہادت برداشت کر رہی ہے، تیسری اپنے چاروں بیٹوں کی قربانی کی خبر سن کر بھی یہ پوچھ رہی ہے کہ "میرے مولا حسینؑ کیسے ہیں؟"۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ممتا صرف جذبات نہیں رہتی بلکہ عقیدے، شعور اور وفاداری کی بلند ترین منزل بن جاتی ہے۔

آج جب مادہ پرستی، خودغرضی، اخلاقی بحران اور تربیتی کمزوریوں نے خاندانی نظام کو چیلنج کر رکھا ہے، کربلائی ماؤں کی سیرت پہلے سے کہیں زیادہ اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ موجودہ دور کی خواتین اگر حضرت فاطمہ زہراؑ کی تربیت، حضرت زینبؑ کی بصیرت، حضرت ام البنینؑ کی وفاداری اور حضرت ربابؑ کے صبر کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیں تو وہ صرف اپنے گھروں ہی نہیں بلکہ پوری نسل کے فکر و کردار کو سنوار سکتی ہیں۔

واقعۂ کربلا ہمیں یہ حقیقت سمجھاتا ہے کہ عظیم بیٹے اتفاقاً پیدا نہیں ہوتے، انھیں عظیم مائیں تیار کرتی ہیں۔ لہٰذا آج کی خواتین کے لیے کربلائی ماؤں کی سیرت محض تاریخ کا ایک باب نہیں بلکہ ایک مکمل تربیتی منشور، ایک عملی نمونہ اور ایک روشن راستہ ہے جو انھیں ایک باشعور، باکردار اور باعظمت معاشرے کی تشکیل میں اپنا حقیقی کردار ادا کرنے کا سبق دیتا ہے۔

کربلائی ماؤں کا تصور

کربلائی ماؤں سے مراد وہ عظیم خواتین ہیں جنھوں نے اپنی اولاد کو دینِ اسلام، محبتِ اہلِ بیتؑ، حق گوئی، ایثار اور قربانی کی ایسی تربیت دی کہ وہ باطل کے سامنے جھکنے کے بجائے شہادت کو ترجیح دینے والے بن گئے۔ کربلا کی مائیں محض رشتۂ مادری کی نمائندہ نہیں بلکہ ایمان، بصیرت، تربیت اور استقامت کی علامت ہیں۔ ان کے نزدیک اولاد کی کامیابی دنیاوی منصب یا مال و دولت نہیں بلکہ خدا اور اس کے دین کی رضا تھی۔

اہم کربلائی مائیں

حضرت فاطمہ زہراؑ

اگرچہ آپؑ واقعۂ کربلا سے کئی سال قبل پردۂ وصال فرما چکی تھیں لیکن امام حسینؑ سمیت اہلِ بیتؑ کی پوری نسل کی فکری و روحانی تربیت آپؑ ہی کے دامن سے وابستہ تھی۔ امام حسینؑ کے کردار میں جو عظمت، صبر، عبادت اور حق پرستی نظر آتی ہے، وہ دراصل تربیتِ فاطمیؑ کا عکس ہے۔

حضرت زینب کبریٰؑ

کربلائی ماؤں میں سب سے زیادہ پُراثر اور جامع کردار جنابِ زینب کبریٰؑ کا ہے۔ آپؑ نے میدانِ کربلا میں نہ صرف اپنے فرزندوں عون و محمد کی عظیم قربانی پیش کی بلکہ ہر شہید کی ماں، بہن اور بیٹی کے لیے صبر و حوصلے کی ایک زندہ اور روشن مثال قائم کر دی۔ آپؑ نے شامِ غریباں کے سناٹے، لاشوں کے بیچ جلتے ہوئے خیموں اور دل دہلا دینے والے مناظر کے باوجود استقامت کا وہ پہاڑ بن کر دکھایا جس نے کربلا کے غم کو جھیلنے کا حوصلہ دیا۔ پھر دورانِ اسیری کوفہ اور دمشق کے درباروں میں آپؑ نے جس جرات، فصاحت اور حکمت کے ساتھ کربلا کے خونِ شہداء کو زندہ رکھا اور امام حسینؑ کے مقدس پیغام کو دنیا کے سامنے اجاگر کیا، اس نے آپؑ کی شخصیت کو صرف ایک بہن یا ماں نہیں رہنے دیا بلکہ ایک عالمگیر پیغام، ایک فکری انقلاب اور ایک لازوال بیداری کی علامت بنا دیا، جس کے سامنے ظلم کے ایوان لرز اٹھے اور حق کی آواز قیامت تک کے لیے امر ہوگئی

حضرت ام البنینؑ

حضرت عباسؑ کی والدۂ ماجدہ حضرت ام البنینؑ وفاداری اور ایثار کا ایسا استعارہ ہیں جن کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ انھوں نے اپنے چاروں بیٹے راہِ حسینؑ میں قربان کر دیے لیکن ان کی فکر کا مرکز اپنی اولاد نہیں بلکہ امامِ وقت کی سلامتی تھی۔ یہ کردار بتاتا ہے کہ حقیقی تربیت خودغرضی نہیں بلکہ مقصد سے وابستگی پیدا کرتی ہے۔

حضرت ام ربابؑ

حضرت علی اصغرؑ اور حضرت سکینہؑ کی والدہ حضرت ام ربابؑ نے صبر و استقامت کا ایسا نمونہ پیش کیا جو قیامت تک یاد رکھا جائے گا۔ اپنے شیرخوار بچے کی شہادت کے باوجود انھوں نے اللہ کی رضا پر سرِ تسلیم خم رکھا۔

حضرت بی بی ام لیلیٰ

حضرت لیلیٰؑ کربلا کی عظیم ماؤں میں سے ایک ہیں جنھوں نے حضرت علی اکبرؑ جیسی باکردار اور شبیہِ رسولؐ شخصیت کو پروان چڑھایا۔

آپؑ کی تربیت کا اثر تھا کہ علی اکبرؑ حق وصداقت اور شجاعت کی اعلیٰ مثال بنے۔ کربلا میں جب علی اکبرؑ میدان کی طرف روانہ ہوئے تو ایک ماں کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اس کے باوجود حضرت لیلیٰؑ نے صبر، رضا اور تسلیم و رضا کا عظیم مظاہرہ کیا۔ ان کا کردار کربلائی ماؤں کے لیے یہ پیغام ہے کہ حقیقی ماں وہ ہے جو اولاد کو حق کی راہ پر قربان کرنے کا حوصلہ رکھے۔

کربلائی ماؤں کا کردار

کربلائی ماؤں نے صرف بچوں کی پرورش نہیں کی بلکہ انسانیت کے معمار تیار کیے۔ انھوں نے اپنی اولاد کو خوف سے نہیں، ایمان سے جوڑا، دنیا سے نہیں، مقصد سے وابستہ کیا اور مفاد سے نہیں، وفاداری سے آشنا کیا۔ ان ماؤں نے اپنے بیٹوں کو یہ سکھایا کہ جب حق اور باطل آمنے سامنے ہوں تو خاموشی جرم بن جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کربلا کے جوانوں نے زندگی کی بجائے حق کا انتخاب کیا۔

کربلائی ماؤں کی سیرت کے نمایاں اوصاف

کربلائی ماؤں کی زندگی کا مطالعہ چند بنیادی اوصاف کی طرف رہنمائی کرتا ہے:

٭مضبوط ایمان اور توکل

٭اولاد کی کردار سازی

٭دین اور مقصد سے وابستگی

٭صبر و استقامت

٭حیا اور وقار

٭حق گوئی اور بے باکی

٭ایثار اور قربانی

٭شعور اور بصیرت

یہ تمام اوصاف آج بھی ایک مثالی عورت اور کامیاب ماں کی پہچان ہیں۔

آج کی خواتین اور کربلائی ماؤں کا پیغام

آج کی عورت بیک وقت ماں، بیوی، بیٹی، استاد، پیشہ ور اور سماجی کارکن کے متعدد کردار ادا کر رہی ہے۔ تاہم جدید دور کے چیلنجز بھی پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہیں۔ میڈیا، سوشل میڈیا، مادہ پرستی، خاندانی انتشار اور اخلاقی بحران نئی نسل کی فکری تشکیل پر گہرے اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں کربلائی ماؤں کی سیرت ایک روشن مینار کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ ہمیں بتاتی ہیں کہ ایک عورت اپنے گھر کی چار دیواری میں رہتے ہوئے بھی قوموں کی تقدیر بدل سکتی ہے اور میدانِ عمل میں نکل کر بھی حق کی علمبردار بن سکتی ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کربلائی سیرت کو عملی زندگی میں کیسے اپنایا جائے؟

٭کردار سازی کو اولین ترجیح دی جائے۔

٭بچوں کو صرف ڈاکٹر، انجینئر یا افسر بنانے کے بجائے انھیں دیانت دار، با اخلاق اور ذمہ دار انسان بنایا جائے۔

٭گھروں کو تربیتی مراکز بنایا جائے۔

٭گھر میں نماز، تلاوت، مطالعہ اور اخلاقی گفتگو کا ماحول پیدا کیا جائے تا کہ بچوں کی فکری بنیاد مضبوط ہو۔

٭مطالعہ اور شعور کو فروغ دیا جائے۔

٭خواتین سیرتِ اہلِ بیتؑ، اسلامی تاریخ اور اخلاقی ادب کا مطالعہ کریں تا کہ وہ اپنی نسل کی بہتر رہنمائی کر سکیں۔

*صبر اور استقامت پیدا کی جائے۔

* مشکلات، معاشی دباؤ اور سماجی مسائل کے باوجود امید اور حوصلے کا دامن نہ چھوڑا جائے۔

*سوشل میڈیا کو مثبت ذریعہ بنایا جائے۔

*سوشل میڈیا پر فضول مشاغل کے بجائے اخلاقی، دینی اور تعلیمی مواد کو فروغ دیا جائے۔

* خدمتِ خلق کو شعار بنایا جائے۔

*ضرورت مندوں کی مدد، فلاحی سرگرمیوں اور سماجی خدمت میں حصہ لے کر ایثار کے جذبے کو فروغ دیا جائے۔

* اولاد کے ساتھ معیاری وقت گزارا جائے۔

*مصروف زندگی میں بچوں کے ساتھ مکالمہ، تربیتی گفتگو اور جذباتی تعلق کو مضبوط بنایا جائے۔

کربلا ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ معاشروں کی تعمیر میدانوں میں نہیں بلکہ ماؤں کی گود میں شروع ہوتی ہے۔ اگر حضرت ام البنینؑ جیسی مائیں نہ ہوتیں تو عباسؑ جیسی وفا وجود میں نہ آتی، اگر تربیتِ فاطمیؑ نہ ہوتی تو حسینؑ جیسی استقامت دنیا نہ دیکھتی اور اگر زینبؑ جیسی بصیرت نہ ہوتی تو کربلا کا پیغام تاریخ کے صفحات میں محفوظ نہ رہتا۔

آج کی خواتین اگر کربلائی ماؤں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنی زندگیوں میں ایمان، شعور، حیا، استقامت، تربیت اور ایثار کو جگہ دیں تو وہ نہ صرف اپنے خاندانوں بلکہ پورے معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عظیم قوموں کی بنیاد عظیم مائیں رکھتی ہیں اور کربلا کی مائیں اس عظمت کی ابدی علامت ہیں۔

❑❑❑❑❑

عاشُورائی سبق سے ظہُور کی تیاری... ہمارا انفرادی و اجتماعی طرزِ زندگی

ڈاکٹر زوّار حُسین (مُحقق و جغرافیہ داں)

قُرآنِ حکیم صرف ایک کتابِ ہدایت نہیں بلکہ انسانی فطرت، نفسیات، معاشرت، سیاست، معیشت اور تمدّن کا ایسا زندہ منشور ہے جو ہر دور کے انسان کو راستہ دکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چودہ صدیاں گُزرنے کے باوجود اس کی تعلیمات تازگی، معنویت اور تاثیر سے بھرپُور ہیں۔ واقعۂ عاشورا دراصل قُرآنِ کریم کے عملی اور متحرک چہرے کا نام ہے اور ظہورِ امام مہدیؑ کی حقیقی تیاری اسی وقت مُمکن ہے جب عاشورا کے پیغام کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حِصہّ بنایا جائے۔

قرآنِ کریم کا اعجاز یہ ہے کہ وہ نہایت عظیم حقائق کو انتہائی سادہ الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ علق میں ارشاد ہوتا ہے:

"كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى، اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى"[1]

ترجمہ: نہیں، بے شک انسان دھوکا کھاتا ہے، اسے دیکھیے تو بے نیاز ہوجاتا ہے۔"

یہ آیت درحقیقت انسانی گناہوں، ظلم، تکبر، استحصال اور بغاوت کی نفسیات کو بے نقاب کرتی ہے۔ جب انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بغیر بھی کامیاب ہوسکتا ہے، تب اس کے اندر فرعونیت و یزیدیت جنم لیتی ہے۔ فرعون، نمرود اور یزید کسی خاص زمانے کے نام نہیں بلکہ احساسِ استغناء کے مُختلف چہرے ہیں۔

امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"من استغنیٰ طغیٰ"

"جو خود کفیل ہے وہ مغرور ہوجاتا ہے۔"

گویا جو اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے، وہ سرکشی اختیار کرلیتا ہے۔

عاشورا ہمیں یہی درس دیتا ہے کہ حقیقی طاقت پروردگار سے وابستگی میں ہے، نہ کہ اقتدار، دولت، دستار اور شہرت میں۔

امام حُسینؑ نے میدانِ کربلا میں ثابت کردیا کہ ظاہری وسائل کی کمی شکست نہیں ہوتی، بلکہ ربِّ العالمین پر توکل اور حق پر

---

[1] علق: ۶

استقامت ہی اصل کامیابی ہے۔

''اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ''

یہ صرف تعزیت یا موت کا جملہ نہیں بلکہ پُوری انسانی زندگی کا فلسفہ ہے۔ ہماری ابتدا بھی اللہ تعالیٰ سے ہے اور ہمارا آخری سفر بھی اسی کی طرف ہے۔ اس رجوع کا مطلب صرفِ جسمانی موت نہیں بلکہ اپنے اختیار سے تکبر، حسد، حرص، کینہ، خودغرضی اور مادہ پرستی جیسی صفات سے نجات حاصل کرنا ہے تاکہ انسان صفاتِ الٰہی کا مظہر بن جائے۔

مفہومِ حدیثِ امامِ جعفر صادق علیہ السلام ہے:

''قبل از موت، اپنے مُحاسبے سے نفس کو بیدار کرو۔''

یعنی اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کرو کہ تمھاری روح اللہ کی قربت سے سرشار ہو جائے۔

اسی لیے بُزرگانِ دین نے ہمیشہ" جہادِ اکبر" یعنی نفس کی اصلاح کو تمام اصلاحات کی بُنیاد قرار دیا گے۔

علامہ طباطبائی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے:

''جس دن انسان اپنے نفس پر حکومت کرنا سیکھ لے گا، اسی دن وہ دُنیا پر حکومت کرنے کے قابل ہو جائے گا۔''

آج دُنیا بھر میں صِرف مادّی ترقی کو کامیابی کا معیار سمجھا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی رپورٹوں کے مُطابق دُنیا میں تقریباً آٹھ ارب انسان آباد ہیں لیکن اس کے باوجود ذہنی دباؤ، تنہائی، ڈپریشن اور بے سکونی میں مُسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق تقریباً ایک ارب افراد کسی نہ کسی ذہنی بیماری کا شکار ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ صرف معاشی ترقی، روحانی سکون کی ضمانت نہیں۔

اسلام ترقی کی مخالفت نہیں کرتا بلکہ ترقی کو انسانیت اور معنویت کے ساتھ جوڑتا ہے۔

کربلا میں انفرادی کمالات اپنی بلندترین سطح پر موجود تھے لیکن معاشرہ مجموعی طور پر زوال کا شکار تھا۔

یہی وجہ ہے کہ صرفِ چند نیک افراد کی موجودگی ظہُور کے لیے کافی نہیں۔ ظہورِ امام مہدیؑ کے لیے ایک ایسا معاشرہ درکار ہے جو عدل، شعور، اخوت اور الٰہی اقدار کے اعتبار سے ایک خاص سطح تک پہنچ چُکا ہو۔

امام مُحمّدِ باقر علیہ السلام فرماتے ہیں:

''ہمارا قائم اس وقت ظہُور کرے گا جب لوگ اس کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ انتظار صرفِ وقت گزاری کا نام نہیں بلکہ مُسلسل تعمیر، تربیت اور اصلاح کا عمل ہے۔

شہید مُطہری فرمایا کرتے تھے:

''انتظارِ فرج ایک مثبت، انقلابی اور عبادی حالت ہے، نہ کہ سُستی اور جمود کا نام۔''

بدقسمتی سے ہم نے بہت سی اسلامی اصطلاحات کے مفاہیم کو مادیت کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ تعلیم کا مطلب صرف ڈگری، کامیابی کا مطلب صرف دولت اور ترقی کا مطلب صرفِ عہدہ اور شہرت سمجھ لیا گیا ہے۔ ہمارا ویلیو سسٹم الٹ چُکا ہے۔ ہم اللہ، رَسُولؐ اور زمانے کے امام سے اس طرح مُنسلک نہیں ہو رہے کہ جتنا حق ہے اور وہی بات جو سیّد الشُّہداءؑ حضرتِ امام حُسینؑ بھی فرمایا کرتے تھے:

''لوگ دُنیا کے بندے ہیں دین کو صرفِ زبان تک محدُود رکھتے ہیں اور جب آزمائش میں مُبتلا ہوتے ہیں تو سچے دیندار بُہت کم ہیں۔''

آج دُنیا میں تقریباً 70 فیصد دولت محض 10 فیصد لوگوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہے، لیکن اس کے باوجود انسانی معاشرے میں عدم مساوات، اضطراب اور ناانصافی مُسلسل بڑھ رہی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دولت اور وسائل بذاتِ خُود کامیابی نہیں۔ اصل کامیابی لقاءاللہ ہے کہ ہمارے انفرادی و اجتماعی اُمورِ زندگانی اس طرح ہوں کہ ہماری مقناطیسیت قُربتِ رَبِّ الْعِزت سے جا ملے اور وہ اتنا کریم ہے کہ روایتوں میں ملتا ہے: ایک مرتبہ جب بندۂ مومن جنّت میں داخل ہو جائے گا تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فردوس بریں میں ہی رہے گا...

امام حُسین علیہ السلام نے کامیابی کے حقیقی معیارات متعین کرتے ہوئے ہدایات عطا فرمائیں:

''علم مع الحلم، والمال مع المروۃ، والفقر مع الصبر''۔

یعنی علم کے ساتھ بردباری، دولت کے ساتھ شرافت و حیا، اور غربت کے ساتھ صبر و عزتِ نفس۔

اگر علم تکبر پیدا کرے، دولت غرور پیدا کرے اور غربت انسان کو ذلت پر مجبور کر دے تو یہ سب بے ثمر ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عبادات بھی بے معنی ہو جاتی ہیں کہ شاعر کہہ اُٹھتا ہے۔

بے فائدہ نماز تیری بے ثمر سجود
کعبے پہ کیوں نہ بوجھ بنے اب تیرا وجود

نہج البلاغہ میں مولائے کائنات رہنمائی فرماتے ہیں:

''علم، دولت سے بہتر ہے، کیونکہ علم تمھاری حفاظت کرتا ہے جبکہ دولت کی حفاظت تمھیں کرنا پڑتی ہے۔''

آج دنُیا مصنوعی ذہانت، روبوٹکس اور آٹومیشن کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ انسان کو صرفِ ایک پیداواری مشین کا پرزہ بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، جبکہ اسلام انسان کو عطا کرنے والا، محبت بانٹنے والا اور دوسروں کے لیے آسانی پیدا کرنے والا وجود بنانا چاہتا ہے۔

فرمانِ حضرت محمدِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برائے ارتقائے انسانی:

"خیر الناس من ینفع الناس"

بہترین انسان وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند ہو۔

اگر ہمارے پاس دولت نہیں تو ہم دُعائیں دے سکتے ہیں، اگر وسائل نہیں تو ہمدردی کر سکتے ہیں، اگر اقتدار نہیں تو انکساری و اخلاص کا مظاہرہ تو کر ہی سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاص اس دور کی نایاب ترین اور انمول دولت بن چُکا ہے۔

چہل حدیث میں آیت اللہ امام خمینیؒ نے بیان فرمایا:

اگر دُنیا، اخلاص کے ساتھ کام کرنے والے چند انسان پیدا کرلے تو تاریخ کا رُخ بدل سکتے ہیں۔"

مثلِ شبیر جو پیغام عمل دیتے ہیں
ایسے ہی لوگ زمانے کو بدل دیتے ہیں

عاشورائی نظام ہمیں صرفِ آہ و زاریاں نہیں بلکہ انفرادی و اجتماعی کردار کی تعمیر کا درس دیتا ہے۔ سالارِ کربلائے مُعلی حضرتِ عباسِ علمدار علیہ السلام، وفاداری کا، حضرت علی اکبر علیہ السلام اطاعت کا، حضرت قاسم علیہ السلام ایثار کا، حضرت زینب سلام اللہ علیہا صبر و بصیرت کا اور امام حُسینؑ ابن علیؑ المُرتضیٰ، آزادی و عزت کا ابدی استعارۂ عظیم الشان بن گئے کہ جس کی کوئی مثال نہیں۔

ملتی ہی نہیں کوئی مثال ایسی دہر میں
بے گور و کفن بھائی ہمشیر سفر میں

قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ اللّٰهَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَا بِاَنْفُسِهِمْ"

"بیشک اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خُود اپنی حالت نہ بدل دے۔"

اس آیت میں ظہور کی تیاری کا فلسفہ پوشیدہ ہے۔ تبدیلی باہر سے نہیں، اندر سے شُروع ہوتی ہے۔

شہید رہبرِ مُعظم آیت اللہ سید علی خامنہ ایؒ فرمایا کرتے تھے:

"انتظارِ امامِ مہدیؑ کا مطلب ایک عادلانہ تمدُّن کی تعمیر کے لیے مُسلسل جدوجہد کرنا ہے۔"

ڈاکٹر علاّمہ مُحمد اقبالؒ نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مُقدّر کا ستارہ

آج اُمتِ مُسلمہ کو انفرادی عبادت کے ساتھ اجتماعی شعور کی بھی اشد ضرُورت ہے۔ ہمیں ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا ہوگی جس میں دیانت، عدل، علم، خدمت، امانت، حیا اور اخوت زندہ ہوں۔ جہاں تعلیم صرف روزگار نہیں بلکہ کردار سازی کا ذریعہ ہو۔ جہاں دولت خدمت کا وسیلہ ہو اور اقتدار امانت سمجھا جائے۔

امام جعفرِ صادق علیہ السلام سے روایت ہے:

''جو شخص امام مہدیؑ کے اصحاب میں شامل ہونا چاہتا ہے، اُسے تقویٰ، حُسنِ اخلاق اور نیک اعمال اختیار کرنے چاہئیں۔''

ظہُور کے مُنتظر وہ نہیں جو صرف دُعائیں مانگتے ہیں بلکہ وہ ہیں جو اپنے کردار، معاشرے اور افکار کو امامِ زمانہؑ کے مقصد سے ہم آہنگ کرتے ہیں۔

شہید اُستاد سبطِ جعفر اپنی شاعری پڑھا کرتے تھے کہ:

حالِ غم سُنائیں گے جب امام آئیں گے
زخمِ دل دِکھائیں گے جب امام آئیں گے
محفلیں سجائیں گے جب امام آئیں گے
بام و در سجائیں گے جب امام آئیں گے

شیخ بہجت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

''اگر تُم چاہتے ہو کہ امامِ زمانہؑ تُمھیں یاد کریں تو پہلے تُم اپنے اعمال ایسے بنالو کہ تُم اُن کی یاد کے قابل بن جاؤ۔''

عاشُورائی دراصل ایک عالمی تربیتی یونیورسٹی ہے۔ اگر مجالسِ حسینؑ سے نکلنے کے بعد ہماری زندگیوں میں دیانت، صبر، اخلاص، ایثار، عبادت، خدمتِ خلق، عدل اور تقویٰ پیدا نہیں ہوتا تو ہمیں اپنے گریہ اور عزاداری کے اثرات کا مُحاسبہ کرنا چاہیے۔

امام حُسینِ مظلُوم نے ہمیں سکھایا کہ زندگی کا مقصد صرفِ زندہ رہنا نہیں بلکہ باوقار اور باکردار رہنا ہے۔ اگر زندگی با مقصد نہیں تو بفرمانِ مولائے متقیان: یہ زندہ انسان بھی چلتی پھرتی لاشیں ہیں...

آج ظہور کی تیاری کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو، اپنے گھروں کو تربیت گاہ، اپنی مساجد و امام بارگاہوں کو مرکزِ بیداری، اپنی درسگاہوں کو علم و اخلاق کا سرچشمہ، اپنے اداروں کو امانت و دیانت کی مثال اور اپنے معاشرے کو عدل و اخوت کا نمُونہ بنائیں۔ اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے دین صرف مساجد و مدارس و عبادت گاہوں تک محدُود نہیں دین پیدائش تا دمِ آخر مُکمل دستور العملِ زیست ہے گویا مُکمل پیکیج ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہماری زندگی کے تمام چھوٹے بڑے اقدامات قرآن وسنت کے مطابق

ہوں۔

روایتوں میں ملتا ہے کہ امام مہدی علیہ السلام ایک ایسے اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں لائیں گے جو ظُلم سے نفرت، عدل سے مُحبت، اور پروردگار سے وابستگی کے جذبے سے سرشار ہوگا۔

اسی طرح درسِ کربلا ہمیں یہی دعوتِ غور وفکر دیتا ہے کہ انتظار صرفِ ایک گھر بیٹھے دعاؤں والا عقیدہ نہیں بلکہ ایک مُسلسل انفرادی واجتماعی ذمہ داری ہے۔ جو قومیں کربلا کے پیغام کو اپنے انفرادی اور اجتماعی طرزِ زندگی میں نافذ کرلیتی ہیں، وہی ظہُور کے لیے حقیقی بنیادوں کی آبیاری کرتی دکھائی دیتی ہیں ان میں صفِ اوّل کے خُوش نصیب علمداروں میں ایران، عراق، یمن، لبنان، فلسطین اور پاکستان کی پاکیزہ ہستیاں ستاروں کی طرح چمکتی دکھائی دے رہی ہیں...

الغرض ہم واقعی ''یالیتنا کنا معکم'' کے دعوے میں سچے ہیں، تو ہمیں اپنے کردار، اپنی سوچ، اپنے خاندان، اپنے اداروں اور اپنے معاشرے کو حُسینی بنانا ہوگا، کیونکہ ظہُور کی راہ کربلا کی طرح قربانیوں سے ہو کر گزرتی ہے اور حُسینی کردار ہی مہدوی معاشرے کی بُنیاد ہے۔

ڈاکٹر علاّمہ مُحمّد اقبالؒ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں:

دُنیا کو ہے اُس مہدیٔ برحق کی ضرُورت
ہو جس کی نِگاہ زلزلۂ عَالمِ افکار

□□□□□

امام حسین علیہ السلام

تحریر: فروہ علی نقوی

اسلام دینِ فطرت اور دینِ کامل ہے، جس کی تعلیمات اور قوانین پر مبنی کتاب کا نام قرآن ہے جس کا موضوع انسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام احکامات انسانیت کی بہتری کے لیے ہدایات فراہم کرتے ہیں۔ انسان سب سے زیادہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں تمام دینی احکامات میں بھی انسان کی ذات کو اولیت دی گئی ہے مثلاً نماز ہر حال میں واجب ہے لیکن حسب حال انسان نماز کو آسانی سے ادا کر سکتا ہے یعنی بیماری کی حالت میں بیٹھ کر لیٹ کر اشاروں میں نماز ادا کی جا سکتی ہے، اسی طرح وقتِ جہاد جب جان کو خطرہ ہو تو ہتھیاروں کے ساتھ دو گروہوں میں نماز ادا کی جا سکتی ہے [1] بالکل اسی طرح روزہ، حج اور جہاد میں بھی مومن کی جان کی حرمت کو مدِ نظر رکھا گیا ہے لیکن جب ہدف بلند ہو اور بات نظریے اور حرمتِ اسلام کی ہو تو انسان اپنی جان، اولاد مال سب کچھ اپنا ہدف حاصل کرنے کی خاطر قربان کر دیتا ہے۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے امیر المومنین علی ابن ابیطالب کے فرزند حسین علیہ السلام کو دیکھیں تو حسین عام انسانوں کے برعکس انسانیت کی معراج پر نظر آتے ہیں کیونکہ انسان وہ ہے جو اپنی بھلائی کو مقدم رکھے اور حسینؑ ابن علیؑ وہ ہیں جو دوسروں کی بھلائی اور مفاد کو ہر بات پر مقدم رکھتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ دعوتِ بیعتِ یزید کے بعد راتوں رات مدینہ کو چھوڑ کر شہر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حرمت بچالی [2] اور مکہ میں اس لیے قیام فرمایا تا کہ ہدایت کے متلاشی چراغ ہدایت سے ضوء حاصل کرتے رہیں لیکن عین حج کے ایام میں حرمت کعبہ برقرار رکھنے کے لیے [3] مکہ کو چھوڑ کر کوفہ کا سفر اختیار کیا کیونکہ اہل کوفہ نے خطوط کے ذریعے اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ امام عالی مقام ان کی قیادت کریں اور یزید کو خلافت اور دینی انحراف سے روکیں۔ امام نے ان کی دعوت

۱۔ سورۃ النساء آیت ۱۰۲

۲۔ مقتل مقرم صفحات ۲۴۵ تا ۲۴۸

۳۔ مقتل مقرم صفحات ۲۹۹ تا ۳۰۳

پر کوفہ کا راستہ اختیار کیا کیونکہ ہدایت متقین کے لیے ہے ا یعنی ایسے لوگوں کے لیے جو اپنے قلب و روح کو ہدایت کے لیے آمادہ کریں، ہدایت جبرً اوقہرً انہیں دی جاتی۔ اہل کوفہ نے دعوہ کیا کہ وہ ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں ایسا رہبر و رہنما چاہتے ہیں جو انھیں یزید کی حاکمیت سے نجات دے [2] چنانچہ امام علیہ السلام نے کوفہ کا راستہ اختیار کیا لیکن بار بار اپنے ساتھیوں پر یہ واضح کرتے رہے کہ نہ دنیا کی طلب نہ اور نہ ہی حکومت کی وہ صرف اپنے جد کی امت کی اصلاح، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے نکلے ہیں۔ [3] لہذا جو لوگ طلب دنیا میں نکلے تھے وہ ساتھ چھوڑ کے جاتے رہے اور امام علیہ السلام انہیں جانے کی اجازت دیتے رہے لیکن زہیر ابن قین جو مولا سے بچ کر نکل جانا چاہتے ہیں [4] امام علیہ السلام انھیں خاص طور پر کاروان ہدایت سے ملحق کر لیتے ہیں جبکہ شبِ عاشور پھر امام علیہ السلام چراغ بجھا کر سب کو نہ صرف جانے کی اجازت دیتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''میرے اہلِ بیتؑ میں سے کسی ایک کا دامن تھام کر لے جاؤ'' [5] جبکہ قبل از شہادت پھر صدائے استغاثہ بلند کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مولا کیا چاہتے ہیں؟

ان تمام کاموں کی وجہ یہی ہے کہ امام علیہ السلام کا ہدف دنیا نہیں بلکہ دین اسلام کی سربلندی ہے۔ امام علیہ السلام کبھی اصحاب کے لاشوں پر لاشے اٹھا رہے ہیں کبھی بھائی بھتیجوں، بھانجوں کے زخموں سے چور جنازے دیکھ رہے ہیں اور سب قربانیاں دینے کے بعد آواز استغاثہ [6] بلند کرنا اس بات کی علامت نہیں کہ کوئی میری جان بچا لے بلکہ امام علیہ السلام کا سوال اسی دین کی بقاء اور اس کے پیغام کی نشر و اشاعت کے لیے ہے۔

آج جو لوگ یہ بیانات دے رہے ہیں کہ دین اسلام انبیاء کی ذمہ داری ہے اور خاتم الانبیاء کے بعد دین کو کوئی خطرہ نہیں تھا اس لیے یہ نہ کہا جائے کہ امام علیہ السلام نے دین بچایا [7]، وہ لوگ درحقیقت آج تک دین کی روح کو نہیں پا سکے۔ دین صرف زبان

۱۔ مقتل مقرم از حضرت علامہ سید عبدالرزاق موسوی المقرم ص ۲۵۷

۲۔ نفس المهموم از شیخ عیاس قمی صفحات ۶۹تا۷۲

۳۔ نفس المهموم از شیخ عباس قمی صفحہ ۶۵

۴۔ تاریخ الطبری جلد ٤ صفحہ ۳۹٦، ۳۳٤، ۳۲۷، ۳۲٤، ۳۲۳

۵۔ مقتل مقرم ص ۱٤۱

۶۔ *"هَلْ مِنْ ذَابٍّ عَنْ حَرَمِ رَسُولِ الله؟ هَلْ مِنْ مُوَحِّدٍ يَخافُ اللهَ فِينا هَلْ مِنْ مُغِيثٍ يَرْجو اللهَ بِإِغاثَتِنا هَلْ مِنْ مُعِينٍ يَرْجو مَا عِنْدَ اللهِ فِي إِعانَتِنا"*

ترجمہ: کیا رسول اللہؐ کے حرم کا دفاع کرنے والا کوئی ہے؟ کیا ہماری خاطر اللہ سے ڈرنے والا موحد کوئی ہے؟ کیا اللہ کی رضا کے لیے ہماری مدد کرنے والا کوئی ہے؟ بحار الانوار- علامہ مجلسیؒ - جلد 45، صفحہ 46

۷۔ جاوید احمد غامدی یوٹیوب پر پروگرام میزان اور فرقان میں سوال کا جواب دیتے ہوئے۔

سے کلمہ پڑھنے کا نام نہیں دین نام ہے فہم وتدبر کا، دین نام ہے آگاہی اور شعور کا، دین نام ہے باطل قوتوں سے ٹکرانے کا، دین نام ہے الٰہی احکامات سے ٹکرانے والی تمام طاقتوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا۔ کلمہ لا الہ الا اللہ کا حق تب ہی ادا ہوسکتا ہے جب تمام طاغوتی طاقتوں کے سامنے عملاً یہ ثابت کیا جائے کہ تم سر کاٹ سکتے ہو لیکن یہ سر صرف اس معبودِ حقیقی کے سامنے جھک سکتا ہے جو مالک کون ومکاں ہے یہی حسین علیہ السلام نے ثابت کر کے دکھا دیا کہ میری آنکھوں کا نور علی اکبر علیہ السلام مجھے بہت پیارا ہے لیکن اللہ کی کبریائی علی اکبر علیہ السلام سے بھی عزیز ہے عباس علیہ السلام میرا زورِ بازو اور طاقت ہے لیکن میری اصل طاقت میرا ایمان ہے جس کی خاطر اپنے شیر کو تپتی ریت پر تڑپتا ہوا دیکھ سکتا ہوں یعنی امام علیہ السلام نے دنیا کو عشقِ حقیقی کا وہ چہرہ دکھا دیا جس سے لوگ اب تک نا آشنا تھے۔ لوگ اولاد اسے پروان چڑھانے اور اس کے ناز اٹھانے کے لیے مانگتے ہیں لیکن حسینؑ نے نماز شب میں اولاد دین پر قربان کرنے کے لیے طلب کی تا کہ لوگوں کو یہ بتایا اور سکھایا جا سکے کہ جو چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دی جائے وہی باقی رہنے والی (بقیۃ اللہ) ہے۔ آج امام علیہ السلام کی قربانی کی اہمیت کو نہ سمجھنے والے خود ذہنی انتشار کا شکار ہیں جو ایک طرف گنہگار اور فاسق حکمران کے آگے سر جھکانے اور اس کی اطاعت کو اسلام سمجھتے ہیں دوسری طرف ان کے بڑے حکومت کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتے ہیں[1] جبکہ امام علیہ السلام کے ماننے والے آج بھی باطل قوتوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہیں اور کسی بھی فاسق کو اپنا رہبر ورہنما بنانے کے لیے آمادہ نہیں کیونکہ حسین جیسا رہنما اور رہبر نہ کوئی تھا نہ ہے نہ ہوسکتا ہے مگر وہ جو حسینی راستے کی طرف رہنمائی کرے[2] کیونکہ حسینی کاروان نظم وضبط، اتحاد وایمان اور اطاعت اولی الامر کی لازوال مثال ہے جہاں بچہ بچہ اپنے جذبات واحساسات کا نہیں بلکہ اذنِ حسینی کا پابند نظر آتا ہے، جہاں خواہش بھی ہے طاقت بھی ہے لیکن حکمِ امام علیہ السلام کے آگے اپنی خواہش، ضرورت، احساس اور تکلیف کی کوئی اہمیت ہے نہ خیال۔

کاروانِ حسین علیہ السلام رہتی دنیا تک اپنے پیروکاروں کو یہ سبق دے گیا کہ عشقِ حسین اطاعت کا نام ہے اس لیے کبھی کسی امام علیہ السلام کو مشورہ مت دینا کیونکہ مشورہ دینا اپنی رائے کو بہتر سمجھنے کی دلیل ہے امام علیہ السلام کو مشیروں کی نہیں مطیع اور فرمانبردار ساتھیوں کی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ اصحابِ حسینؑ میں عمر رسیدہ افراد ہوں یا کڑیل جوان سب امام علیہ السلام کے مطیع ہیں نہ کوئی اعتراض نہ مشورہ صرف اطاعت یہی وجہ ہے کہ جہاں امام علیہ السلام جیسا کوئی کمانڈر اور سپہ سالار نہیں وہاں لشکرِ حسینی اور فوجِ حسینی جیسی کوئی فوج نہیں۔

دنیا بھر کی افواج کا فوجِ حسینی سے نہ کوئی موازنہ ہے نہ مقابلہ چہ جائیکہ لشکرِ یزید جو بے غیرتی، بزدلی، کم ہمتی، کردار کی پستی اور اخلاقی گراوٹ کا منہ بولتا ثبوت ہے کیونکہ جو فوج دس، گیارہ اور بارہ سالہ بچوں سے مل کر مقابلہ کرے اسے لشکرِ مردمان (مردوں کا

۱۔ تاریخ بنی امیہ، اور تاریخ بنوعباس۔ نیز خلافت امیر المومنین میں امیر شام۔ کا حکم خلیفہ پر سر نہ جھکانا جس کا ذکر تاریخ۔ کی تمام کتابوں میں موجود ہے۔

۲۔ مراد ہے علماء اور مراجعین عظام۔

لشکر) نہیں کہا جا سکتا بلکہ اصلاً چھ ماہ کے بچے پر تیر سہ شعبہ چلانے والے اور جنگ ختم ہونے کے بعد نیز اپنی فتح کا اعلان کرنے کے بعد نہ صرف عورتوں بلکہ چھوٹے چھوٹے بچوں سے غیر انسانی سلوک کرنے والے نہ صرف انسان کہلانے کے قابل نہیں بلکہ اسفل السافلین کے مقام پر ہیں۔[1]

دوسری طرف لشکر امام علیہ السلام ہے جسے اگر بہترین فوج کی صفات وخصوصیات کے پیمانے پر دیکھا جائے تو اس لشکر جیسی شجاعت، ثابت قدمی، صبر وحوصلہ، تحمل و برداشت اور اطاعت فرمان خداوندی اور پیرویٔ اولی الامر کہیں نہیں ملتی جس کی منہ بولتی تصویر کم سن شہزادہ قاسم علیہ السلام ہیں جس کے علم وشعور اور معرفت کا یہ حال ہے کہ موت ان کے لیے شہد سے میٹھی ہے اور غیرت یہ سننے پر آمادہ نہیں کہ فوج یزید مخدراتِ عصمت وطہارت کے خیام کی طرف قدم بڑھائے گی۔

ان کے بعد اگر عون ومحمد علیہما السلام کو دیکھا جائے تو زینبؑ کے فرمانبردار فرزند دوران جنگ بھی ان حدود کی پابندی کرتے نظر آتے ہیں جن کا تعین ماں نے رخصت کرتے ہوئے کر دیا تھا۔

اطاعت عباس علیہ السلام کا تو ذکر ہی محال ہے کیونکہ کاروان حسینی کے بچے، عورتیں اور جوان سب مطمئن ہیں کہ عباس علیہ السلام ہے لیکن حکم امام علیہ السلام نہیں تو عباس علیہ السلام نہ نہر پر جائیں گے نہ تلوار چلائیں گے۔ حسین کہیں تو خیام برپا کر دیں گے حسین کہہ دیں تو ان ہی خیموں کو نہر کے کنارے سے ہٹا دیں گے۔ نہ سوال نہ اعتراض نہ تیوری پر بل صرف ایک مقصد ہے کہ میری زندگی میں امام علیہ السلام وقت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے، یہی حال اصحاب کی اطاعت ووفا کا ہے کہ کوئی دامن شبیری سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں۔

ایسا کیوں نہ ہو حسینؑ ہے ہی محبت ومودۃ کے قابل جس سے اللہ رب ذو الجلال والاکرام اور اس کا حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبت کریں جو آغوش خاتون جنت سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا اور امیر المومنین علی ابن ابیطالب میں پروان چڑھے اور جس کے گریہ کرنے پر اپنے کٹتے ہوئے جگر کی تکلیف کو بھول کر حسن علیہ السلام کہیں:

لا یوم کیومك یا ابا عبداللہ[2]

اے اباعبداللہ آپ کے دن جیسا کوئی دن نہیں۔

یہ وہ حسینؑ ہے جس کی شہادت کے وقت تمام انبیاء وملائکہ اس کی جرات وشجاعت واستقامت کو سلام کرنے کے لیے تشریف لائیں یہاں تک کہ زخموں سے چور بدن، سوکھی زبان لشکر کی جدائی اور اہل حرم کی تنہائی کے خیال کے باوجود اتنے پرسکون ہیں کہ

۱۔ والتین: ۵

۲۔ الامالی (شیخ صدوق صفحہ ۱۷۷) اور لہوف (سید ابن طاووس) الامالی، الشیخ الصدوق، مجلس 28، حدیث 4

سند: عن الصادق علیہ السلام، عن ابیہ، عن جدہ علیہ السلام قال: دخل الحسین علیہ السلام علی الحسن علیہ السلام... فقال الحسن علیہ السلام: "ولکن لا یوم کیومک یا اباعبداللہ..."

رب کائنات نفس مطمئنہ کہہ کر مخاطب فرما رہا ہے،

یَاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ

اے اطمینان والی روح۔

ارْجِعِیۤ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً[1]

تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش۔

یعنی تمام دکھوں، تکلیفوں، اذیتوں اور مصیبتوں اور پیاس کی شدت کے باوجود حسین علیہ السلام مطمئن ہیں ایسے مطمئن کہ اللہ انھیں "**راضیۃ مرضیہ**" کہہ کر پکار رہا ہے جبکہ دوسری طرف پانی بھی ہے، مال بھی، جنگ کے تمام ہتھیار اور ظاہری فتح کا یقین ہونے کے باوجود اطمینان نہیں۔

آقا کی محبت سنت الٰہیہ اور سنت خاتم النبیین ہے کیونکہ مولا حسینؑ معراجِ انسانیت ہیں۔

کربلا نے دنیا کو سکھایا کہ حق کے آگے سر جھکانا عبادت ہے، اور باطل کے آگے گردن کٹوانا عزت۔

مولا نے ثابت کیا کہ انسانیت کی اصل بلندی تعداد میں نہیں، اصولوں پر ڈٹ جانے میں ہے۔ مولا کی شجاعت اور استقامت ہی تو کربلا کی پہچان ہے۔

شجاعت ایسی کہ اپنے جانثاروں کے ساتھ (جن میں بچے اور بوڑھے شامل ہیں) تیس ہزار کے لشکر کے سامنے ڈٹ جانا۔ نیزوں کی برسات میں "**ھل من ناصر ینصرنا**" کی صدا۔ یہ شجاعت تلوار کی نہیں، یقین کی تھی۔

* استقامت ایسی کہ جس پر تاریخ انسانیت حیران ہے۔ پیاس، زخم، بچوں کی چیخیں، بہنوں کی بے بسی... سب کچھ سہہ گئے مگر ایک قدم پیچھے نہ ہٹے۔ یزید کی بیعت کے بدلے پوری دنیا مل رہی تھی، مولا نے پھر بھی "**ھیھات منا الذلۃ**" ذلت ہم سے بہت دور ہے/ ہم ذلت کو کبھی نہیں اپنائیں گے[2] کہہ دیا۔

ان کی استقامت نے ہمیں سکھایا کہ ہار وہ نہیں جو میدان میں ہو جائے، ہار وہ ہے جو اصولوں سے سمجھوتہ کر لے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف حسینؑ بلکہ حسینیت ناقابل تسخیر ہے کیونکہ آج بھی سر مل سکتا ہے بیعت نہیں یعنی حسین اور حسین والے آج بھی باطل کو حق سے مخلوط نہیں ہونے دیں گے ہمیشہ غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتے رہیں گے اور مولا کا یہ پیغام ہمیشہ ان کے چاہنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتا رہے گا،

۱۔ الفجر: ۲۷، ۲۸

۲۔ مقتل مقرم، مقتل ابی مخنف، نفس المہموم

مثلی لا یبایع مثلہ[1]

''مجھ جیسا اس جیسے کی بیعت نہیں کرے گا۔''

اور امام علیہ السلام عالی مقام کا یہ جملہ امام علیہ السلام کی بلندیٔ افکار اور مقام عبودیت کا احساس دلاتا رہے گا:

''ماذاوَ جَدَمَنْ فَقَدَكَ وَ ما الَّذِي فَقَدَمَنْ وَ جَدَكَ''[2]

پروردگار؛ جس نے تجھے پالیا اس نے کیا کھویا اور جس نے تجھے کھو دیا اس نے کیا پایا۔

بلا شک وشبہ جس نے رب کائنات کو پالیا وہ ذات اقدس حسینؑ ابن علیؑ کی ہے پس حسینؑ نے کچھ بھی نہیں کھویا بلکہ دنیا و آخرت میں ایسی سرفرازی حاصل کرلی کہ دشمن تمام طاقت واسباب رکھنے کے باوجود اتنا بے بس نظر آتا ہے کہ حسین علیہ السلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے تیروں کی بوچھاڑ کرتا ہے نیزوں سے زخمی کرتا ہے قلب وذہن اور ہمت کو پسپا کرنے کے لیے یہ سوچ کر علی اکبر علیہ السلام اور عباس علیہ السلام کو مارتا ہے کہ جوان بیٹے اور بھائی کی لاش کو اس دلخراش حال میں دیکھ کر حسین جی نہیں پائیں گے لیکن جب حسینؑ میدان میں آئے تو بتا دیا کہ جس نے خدا کو پالیا اس نے سب کو کھونے کے باوجود کچھ نہیں کھویا۔ میرے بازوؤں میں اب بھی قوت حیدر کرار موجود ہے اب دشمن حسینؑ کو مٹانے کے لیے وہ حربہ آزماتا ہے جو اس سے پہلے تاریخ انسانیت میں نہیں آزمایا گیا تھا یعنی پامالی، جی ہاں حکم دیا گیا کہ حسین علیہ السلام کی لاش پر ایسے گھوڑے دوڑاؤ کہ حسینؑ کا جسم باقی نہ رہے، یہ تمام کام دو مقاصد کے زیر اثر تھے۔

۱۔ حسین علیہ السلام کو درس عبرت بنا دو تاکہ آئندہ کوئی کبھی کسی ظالم کے سامنے بالخصوص یزید کے سامنے سر نہ اٹھائے۔

۲۔ حسین علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کے نام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دو۔

ان مقاصد کے تناظر میں جب دیکھا جائے تو یزید بے بسی کی تصویر نظر آتا ہے کیونکہ وہ تمام طاقت وسرمایہ رکھنے کے باوجود نہ ہی حسینؑ کو مٹا سکا نہ ہی امام علیہ السلام کے نام کو عبرت بنا سکا بلکہ مولا کا نام رہتی دنیا تک باشعور لوگوں کے لیے درس استقامت وشجاعت بن گیا جبکہ یزید حکومت حاصل کرنے کے باوجود تہی داماں رہ گیا۔

ہاں، یزید کی بے بسی ہی تو کربلا کا دوسرا رخ ہے۔

ظاہر میں تخت، تاج، فوج، خزانے... سب کچھ اس کے پاس تھا۔ مگر حقیقت میں وہ سب سے زیادہ بے بس تھا۔

* طاقت کے باوجود بے بس * ۔ حسینؑ کا سر کاٹ سکتا تھا، مگر حسینؑ کا پیغام نہیں مٹا سکا۔

* فتح کے باوجود بے بس * ۔ میدان جیت گیا، مگر تاریخ ہار گیا۔ آج بھی ''یزید'' نام لعنت بن کر رہ گیا۔

---

[1]۔ ڈھائی سو سالہ انسان از رہبر معظم علی خامنہ ای صفحہ ۴۸۰

[2]۔ دعائے عرفہ

* زندہ رہ کر بھی بے بس * - مولا شہید ہو کر امر ہو گئے اور یزید تخت پر بیٹھ کر بھی رسوا ہو گیا۔

اللہ کی قسم، ظالم کی سب سے بڑی بے بسی یہی ہے کہ وہ مظلوم کو مار تو سکتا ہے، مٹا نہیں سکتا۔

کربلا نے ثابت کر دیا کہ تلوار کا زور وقتی ہے، اور حق کی آواز ابدی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فوج کی کثرت کے باوجود یزید کی شکست کی وجہ خود اس کی سوچ اور قیادت کی خامیاں بن گئیں امام علیہ السلام عالی مقام اور یزید کا نہ کوئی موازنہ ہے نہ مقابلہ، کہاں طیب و طاہر شجر نبوت و طہارت اور شجر خبیثہ کا پروردہ لیکن جب دنیاوی لحاظ سے ہی سرسری نظر ڈالیں تو دونوں کی قیادت میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

امام علیہ السلام حسینؑ نے قیادت کے ایک ایسے مفہوم سے ہمیں روشناس کروا دیا ہے، جس سے حکومت و بادشاہت نا آشنا تھی جس قیادت کو لوگ تکبر کی بدولت نفوس پر حکمرانی سمجھ بیٹھے تھے امام علیہ السلام نے بتایا:

قیادت = خدمت ہے حکم نہیں۔

امام علیہ السلامؑ نے کبھی خیمے میں بیٹھ کر حکم نہیں دیا۔ جب پانی ختم ہوا تو خود مشکیں اٹھائیں۔ جب اصحاب شہید ہوئے تو خود ان کے جنازے اٹھائے۔ ان کی قیادت کا اصول تھا: جو تکلیف دوسرے لوگ سب سے آخر میں برداشت کریں وہ پہلے خود سہو۔

قیادت = اختیار، مجبوری نہیں۔

عاشورہ کی رات امام علیہ السلامؑ نے سب کو اجازت دی کہ "اندھیرا ہے، چلے جاؤ۔ "لیکن کوئی جانے کو تیار نہیں ہوا۔ اصل رہبر وہی ہے جو لوگوں کو ڈرا کر نہیں، قائل کر کے ساتھ رکھے۔

قیادت = اصول، مفاد نہیں۔

یزید کی طرف سے امن کی پیشکش آئی: "بیعت کر لو، حکومت مل جائے گی"۔ امام علیہ السلامؑ نے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کی قیادت کا محور کرسی نہیں، سچ تھا۔ لیڈر وہی جو مشکل وقت میں اصول نہ بیچے۔

❑❑❑❑❑

تحریک حسینی اور مزاحمت کے معیارات

فرح بتول جلبانی

بی ایس اردو (ڈیرہ غازی خان)

کربلا: حق و استقامت کا ابدی مکتب

تاریخ میں کچھ واقعات ایسے بھی ہیں جو صرف اپنے زمانے تک محدود نہیں بلکہ آنے والی کئی صدیوں تک اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور یوں وہ صرف ایک واقعہ نہیں رہتے بلکہ ایک زندہ فکر اور تحریک کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کربلا بھی ایک زندہ فکر اور جاوداں تحریک کا نام ہے۔ یہ محض سن 61 ہجری کے چند دنوں کی داستان نہیں بلکہ حق و باطل کے درمیان ایک معرکے کا روشن ترین باب ہے جو ہمیشہ جاری رہے گا۔ کربلا کی تپتی ہوئی ریت پر امام حسین علیہ السلام نے اپنے اہل و عیال جن میں شیر خوار معصوم علی اصغرؑ اور شبیہہ پیغمبر شہزادہ علی اکبرؑ جیسے جوان بھی شامل ہیں، اپنے خون سے جو تاریخ رقم کی اس سے انسانیت کو یہ درس دیا کہ حق کی حفاظت کے لیے ایمان درکار ہوتا ہے نہ کہ تعداد و وسائل۔ کامیابی کے لیے ظاہری طاقت نہیں بلکہ استقامت کا ہونا ضروری ہے اور عزت کی زندگی کو ہمیشہ ذلت کی زندگی پر ترجیح دی جاتی ہے۔

امام حسینؑ نے اپنے قیام کا مقصد واضح کرتے ہوئے فرمایا:

''میں امت محمدی کی اصلاح کے لیے نکلا ہوں، میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ارادہ رکھتا ہوں۔''[1]

یہ جملہ تحریک حسینی کے پورے فلسفے کا خلاصہ ہے۔ امام کی جدوجہد حکومت اور اقتدار کے لیے نہیں بلکہ ہدایت، دین اور انسانیت کی بقاء کے لیے تھی۔

رمز قرآن از حسین علیہ السلام آموختیم

ز آتش او شعلہ ها اندوختیم[2]

۱۔ شیخ مفید، الارشاد، ج۲

۲۔ (اقبال، اسرار خودی)

امام حسینؑ صرف ایک تاریخی شخصیت نہیں بلکہ قرآن مجید کی عملی تصویر اور اسلام کی حیات کے محافظ ہیں۔ اگر امام حسینؑ کی قربانی نہ ہوتی تو آج دینِ رسولؐ کا کوئی نام ونشان ہی نہ ہوتا۔ امام حسینؑ نے ہی اسلام کو زندگی بخشی۔

تحریکِ حسینی ایک الٰہی تحریک

کربلا کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ امام حسینؑ کا قیام ذاتی یا سیاسی اختلاف کا نتیجہ نہیں تھا۔

یزید ملعون کی حکومت کے قیام کے بعد اسلامی معاشرے میں عدل و دیانت، تقوی اور دینی و شرعی اقدار کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ ایسے ماحول میں امام حسینؑ نے خاموشی کو گناہ اور قیام کو فریضہ سمجھا۔ آپ کو معلوم تھا کہ اس راستے کا اختتام شہادت ہے لیکن آپ کے نزدیک اپنے نانا رسولؐ کے دین کی حفاظت اور امت کی بیداری بہت اہم تھی۔ ''حسینؑ کی تحریک کا مقصد صرف ایک حکومت کو گرانا نہیں تھا بلکہ امت کے ضمیر کو بیدار کرنا تھا''۱

مزاحمت کا اولین معیار: معرفتِ حق

ہر مزاحمتی تحریک کی بنیاد حق شناسی ہوتی ہے۔ جب تک انسان کو معرفتِ حق نہیں ہوگی تب تک وہ باطل کے خلاف صحیح موقف اختیار نہیں کر سکتا۔ کربلا میں معرفتِ حق نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ امامؑ نے ہمیں عملی طور پر بتایا کہ حالات کے جبر، معاشرتی مصلحتوں اور کسی بھی سیاسی دباؤ کے باوجود حق کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

مولا علیؑ فرماتے ہیں۔

''حق کو پہچانو اہل حق خود پہچان لو گے''۔۲

دوسرا معیار بصیرت

کربلا صرف جذبے کا نام نہیں بلکہ شعور اور بصیرت کا نام ہے۔ امام حسینؑ کے تمام اصحاب بصیرت رکھتے تھے۔ انھوں نے امامؑ کا ساتھ صرف جذباتی وابستگی کی بنیاد پر نہیں دیا بلکہ بصیرت کی وجہ سے اپنی جانیں قربان کیں۔ شب عاشور جب امامؑ نے چراغ بجھا کر اپنے اصحاب سے فرمایا کہ دشمن کو صرف مجھ سے غرض ہے آپ لوگ جانا چاہتے ہیں تو جا سکتے ہیں تو باوفا اصحاب نے ساتھ چھوڑنے کا تصور بھی نہ کیا۔ یہ وفاداری بصیرت کا ہی نتیجہ تھی۔

۱۔ شہید مطہری، حماسہ حسینی

۲۔ نہج البلاغہ حکمت 262

''کہہ دیجئے یہی میرا راستہ ہے۔ میں اور میرے پیروکار بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔''[1]

تحریک حسینی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ مزاحمت کی ابتداء شعور و بصیرت سے ہوتی ہے نہ کہ جذبات سے۔

تیسرا معیار: ظلم کے سامنے عدم تسلیم

کربلا کا سب سے عظیم درس یہ ہے کہ ظلم کے سامنے جھکنا جائز نہیں

''اور ظالم کی طرف جھکاؤ نہ کرو''[2]

جب امام حسینؑ سے یزید ملعون کی بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو امامؑ نے فرمایا۔

''میرے جیسا شخص اس (یزید) جیسے شخص کی بیعت نہیں کرسکتا''

یہ جملہ صرف ایک سیاسی موقف نہیں بلکہ آزادی اور عزت نفس کا منشور ہے۔

امامؑ نے بتایا کہ خاموشی کا مطلب ظلم کی تائید ہے۔

اس لیے مزاحمت و مقاومت لازمی ہے۔

چوتھا معیار: قربانی

تاریخ کی ہر بڑی تحریک قربانی مانگتی ہے لیکن کربلا ایک ایسی تحریک ہے جو عظیم قربانی کی معراج ہے۔

شہزادہ معصوم علی اصغرؑ کی معصومیت، حضرت قاسمؑ کی بہادری، حضرت علی اکبرؑ کی جوانی اور حضرت عباسؑ کی وفاداری سب اسی قربان گاہ میں قربان ہوگئیں لیکن مقصد پر سمجھوتہ قطعاً نہ کیا۔

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر

معنی ذبح عظیم امد پسر[3]

۱۔ یوسف:108

۲۔ ہود:113

۳۔ اقبال، اسرار خودی

پانچواں معیار استقامت

حسینی مزاحمت کا ایک اہم معیار استقامت اور ثابت قدمی ہے۔ وقتی جوش اور جذبہ تو ایک ابھار کی طرح ہوتا ہے جو جلدی ختم ہوجاتا ہے۔ مسلسل مشکلات میں ثابت قدم رہنا ہی کامیابی ہوتی ہے۔ کربلا میں سب شہید ہوتے گئے لیکن کسی نے بھی حق کا راستہ نہیں چھوڑا اور استقامت کا عملی نمونہ پیش کیا۔ حضرت عباسؑ نے صبر و استقامت کی جو اعلیٰ مثال قائم کی تاریخ اس کی مثال دینے سے قاصر ہے۔ فرات تک رسائی حاصل ہوتے ہوئے بھی آپ نے اپنی پیاس کو اہمیت نہ دی بلکہ معصوم بچوں اور اپنے امامؑ کی پیاس کو محسوس کیا۔ انھوں نے اپنی اس وفاداری و ایثار سے یہ ثابت کیا کہ مزاحمت صرف لڑنے کا نام نہیں بلکہ نفس پر قابو پانے کا نام بھی ہے۔

بی بی زینب س مزاحمت کا دوسرا مرحلہ

جب امام حسینؑ نے کربلا میں مزاحمت کی بنیاد رکھی تو بی بی زینب سلام اللہ علیہا نے اس مزاحمت کو دوام بخشا۔ آپ نے اپنے خطبوں سے یزیدیت کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ جب یزید ملعون نے پوچھا کہ خدا نے آپ کے ساتھ کیا کیا تو بی بی زینب سلام اللہ علیہا نے بہت خوبصورت جواب دیا۔

’’میں نے کربلا میں سوائے خوبصورتی کے کچھ نہیں دیکھا‘‘[1]

شہید رہبر تحریک حسینی کی عملی تصویر

کربلا نہ تو ماضی کا قصہ ہے اور نہ ہی کتابوں تک محدود ہے بلکہ ہر دور میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے مولا حسینؑ کے پیغام کو جاری رکھا اور ان کی راہ پہ قائم رہے۔ شہید رہبر معظم سید علی خامنہ ای بھی ان میں سے ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ جنھوں نے اپنی زندگی مظلوموں کی حمایت اور اور حق کی سربلندی کے لیے قربان کردی۔ انھوں نے ہمیں یہ درس دیا کہ حسینیت کا مطلب صرف عقیدت نہیں بلکہ مزاحمت و قربانی ہے۔ وہ آخری سانس تک مظلوموں کے حامی اور حق کے علمبردار رہے۔ انھوں نے اپنی جان قربان کر کے آج کے دور میں یہ ثابت کیا کہ مولا حسینؑ کے سچے پیروکار وقت آنے پر کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتے۔ آج جب ہم شہید رہبر معظم کی قربانی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ واضح نظر آتا ہے کہ انھوں نے آج کے دور میں، آج کی کربلا میں کل کی کربلا کا فلسفہ سمجھا دیا۔ انھوں نے سمجھایا کہ فقط دین دار حسینی نہیں بن سکتے بلکہ حسینی بننے کے لیے دین شناسی لازمی ہوتی ہے۔ وہ بار بار سمجھاتے رہے کہ آج بھی شمر ملعون (نیتن یاہو کی شکل میں) موجود ہے۔ آج بھی کربلا اور مولا حسین کے قافلے کو پہچاننے کی

۱۔ اللہوف

ضرورت ہے۔شہید رہبر معظم کے دیے گئے سبق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر ہمیں آج کی کربلا کی کوئی معرفت نہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم ماضی کی کربلا کو سمجھ ہی نہیں سکے۔آج کی کربلا کو سمجھنا لازم ہے کیوں کہ ہم سے اسی کے متعلق پوچھا جائے گا۔آج فلسطین، پاراچنار، کشمیر و دیگر مظلوم خطے اسی پیغام کا تسلسل ہیں کہ جہاں آج بھی حق و باطل کی جنگ جاری ہے۔

شہید رہبر معظم نے سمجھایا کہ آج بھی حق کے لیے ڈٹ جانا حسین کے قافلے میں جا ملنے کی شرط ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے عاشقوں کے دلوں میں ان کی یاد صرف ایک راہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حسینی مجاہد کے طور بھی باقی رہے گی کہ جنھوں نے اپنے خون سے اپنے نظریے کی گواہی دی۔

نتیجہ

تحریک حسینی محض تاریخ کا ایک باب نہیں بلکہ ایک ایسے مکتب کا نام ہے جو آج بھی جاری ہے۔امام حسینؑ نے اپنے خون سے ہمیں یہ سبق دیا کہ اصولوں پر سمجھوتے سے کامیابی نہیں ملتی۔کربلا سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ مزاحمت صرف جنگ نہیں بلکہ یہ ایک فکر کا نام ہے،شعور اور بصیرت کا نام ہے۔جب تک دنیا میں ظلم ہوتا رہے گا تب تک اسی حسینی مکتب کا پیغام بھی جاری رہے گا۔جب تک حق و سچ کے تلاش کرنے والے موجود ہیں تب تک کربلا انسانیت کو راستہ دکھاتی رہے گی۔

مصادر

۱۔قرآن مجید

۲۔نہج البلاغہ

۳۔شیخ مفید،الارشاد

۴۔شہید مطہری،حماسہ حسینی

۵۔علامہ اقبال،اسرار خودی

۶۔سید ابن طاؤس،اللہوف

□□□□□